

روشن زانوئے

ڈاکٹر صادق نقوی

ریڈر شعبہ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

روشن زانوئے

ڈاکٹر صادق نقوی

ریڈر شعبہ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

891.429

ACC. NO.

338

ناشر :- باب العلم سوسائٹی - حیدرآباد

سنہ اشاعت :- جولائی ۱۹۹۰ء مطابق ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ

تعداد :- پانچ سو

کتابت :- میرزا عادل نجی

سرورق :- علی ممتاز آرٹسٹ

طباعت :- رحیم پریس - چھتہ بازار

مصنف کاپیتہ :- $\frac{۳۶۱}{۱۶}$ - ۸ - ۲۲ - دار الشفاء - حیدرآباد

۲۲...۵ - آندھرا پردیش

قیمت :- ۳۰ روپے

اپنے چچا ہندوپاک کے نامور صحافی و ادیب

محترم سید بادشاہ حسین نقوی

کے نام

جن کی محبت، شفقت اور تربیت نے مجھے

ادب کے راستہ پر چلنے کا سلیقہ عطا کیا۔

عرض صادق

یہ میرا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ ”رشن لکیریں“ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ ”جذبہ صادق“ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا جو میری مذہبی شاعری پر مشتمل تھا۔ ان دونوں مجموعوں کی جو پذیرائی ہوئی میری توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ جس کے لئے میں ارباب ذوق کا ممنون ہوں۔

”رشن زلویئے“ میرا تیسرا مجموعہ ہے جسے میں بڑے خلوص و احترام سے اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں

شاعری مجھے اپنی والدہ محترمہ سلیمہ بیگم عفت مرحومہ کا ورثہ ہے۔ میرے والد بزرگوار مولوی سید احمد حسین صاحب مرحوم نے اپنی زندگی اسپورٹس کے میدانوں میں گزاری۔ میرے چچا ہندوپاک کے نامور صحافی و ادیب مولوی سید بادشاہ حسین صاحب نے ابتدائی زندگی میں میری تربیت فرمائی۔ میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ میں نے باپ اور ماں دونوں کا ورثہ پایا اور چچا کی تربیت سے پوری طرح فیضیاب ہوا۔

سیری ابتدائی زندگی اسپورٹس کے میدانوں پر گزری۔ اسکول کی زندگی ہی سے مجھے کھیل سے ربط رہا۔ سٹی کالج کی کرکٹ ٹیم کا نمائندہ اور ٹیل ٹینس ٹیم کا کپتان رہا۔ اسکول کی تعلیم ختم ہوئی تو حیدرآباد کی مشہور درس گاہ نظام کالج میں داخل ہوا۔ نظام کالج کی فٹبال کرکٹ اور اتھلیٹک ٹیموں میں شامل رہا۔ ۱۹۵۸ء میں انٹرویوورٹسٹی فٹبال ٹورنمنٹ میں عثمانیہ یونیورسٹی کی نمائندگی کے لئے منتخب ہوا۔ حیدرآباد کے دو مشہور چھوٹے چھوٹے کلب اور حیدرآباد ارسل کلب کے نمائندہ کی حیثیت سے میں نے ہندوستان بھر میں کئی ٹورنمنٹس کھیلے۔ اسپورٹس سے یہ وابستگی کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی جاری رہی۔

۱۹۵۹ء میں بی ایس سی کی ڈگری حاصل کر کے اپنی ملازمت کا آغاز میں نے آل سینٹس ہائی اسکول سے کیا۔ جہاں ریاضی پڑھانے کے علاوہ مجھے کرکٹ ٹیم کی کوچنگ کا فریضہ بھی سونپا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں سینک اسکول کورکنڈہ و ساکھا ٹینم منتقل ہوا۔ یہاں بھی ریاضی اور طبیعیات پڑھانے کے ساتھ ساتھ مجھے اسپورٹس ڈائریکٹر اور سٹی آفیسر کی زائد ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ ۱۹۶۱ء میں سینک اسکول کورکنڈہ سے حیدرآباد پبلک اسکول بیگم پیٹ منتقل ہوا۔ ۱۹۶۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ میں حیثیت

لکچر رتھر ہو، اب بھی یونیورسٹی سے بحیثیت ریڈروالبتہ ہوں۔
یہ تو ملازمت کے سفر کی تفصیل تھی۔ اب مصروفیتوں کی تفصیل بھی
سن لیجئے۔ ۱۹۶۵ء میں، میں نے پھر سے تعلیم کا آغاز کیا۔ نیک اسکول کی
نوکری، کلاس میں ریاضی اور طبیعیات پڑھانے کے ساتھ ساتھ اسپورٹس
ڈائریکٹر اور این سکی سی کی زائد مصروفیات کے باوجود میں علی گڑھ سے تاریخ میں
ایم اے پاس کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف فٹبال سے فٹبال
میں ڈپلوما کورس کی تکمیل کی۔ پھر ۱۹۷۰ء میں سائیک اسکول سے حیدرآباد
پبلک اسکول منتقل ہوا۔ اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے میں نے
ایم فل کی تکمیل کی۔ بی سی سی آرمی ونگ سے نیوی میں منتقل ہونے کے لئے کو چین
میں دو ماہ کی ٹریننگ کی۔ ۱۹۷۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازمت کرتے ہوئے
میں نے فارسی زبان کا ڈپلوما اور پی۔ پیج ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ میری پی ایچ ڈی
کا مقالہ ”مسلم ادارے اور دورِ قطب شاہی میں ان کے کارناموں پر تھا۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنی اسپورٹس کی زندگی کو
ترک کر دیا۔ قلم جو کبھی بھی ہاتھ سے نہ چھوٹا تھا زیادہ روانی کے ساتھ چلنے لگا۔

پچھلے بارہ سال کے عرصہ میں میرے (۲۶) مقالے تاریخ ادوار و ادب کے مضامین
میں شائع ہو چکے ہیں۔ تاریخ کی ایک کتاب ”حیدرآباد کے قطب شاہی عاشور خانے“

سال بھر محفلوں، جلسوں، شاعروں اور مقاصدوں کا سلسلہ رہتا ہے۔ کوئی
 مہلت ایسا نہیں ہوتا جس میں کوئی محفل نہ سجتی ہو۔ میں ان تمام میں بھرپور
 حصہ لیتا ہوں۔ اکثر جلسوں، سمیناروں اور سیمپوزیمس میں بحیثیت مقرر مدعو
 کیا جاتا ہوں۔ شاعروں اور مقاصدوں میں اپنا طرہ اور غیر طرہی کلام
 پیش کرتا ہوں۔ یہ سب کچھ میں نے صرف اس لئے لکھا ہے کہ آپ کی خدمت
 میں اپنی زندگی کے شب و روز کا ایک خاکہ پیش کر سکوں اور آپ کی خدمت
 میں یہ عرض کر سکوں کہ میں نے شاعری کو کبھی بھی اندھیر و نہیں سمجھا میری شاعری
 میری مصروفیات کے درمیان میرے لئے ذہنی سکون حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے
 میں نے جو کچھ بھی کہا ہے، میرے اپنے مشاہدہ، تجربہ اور احساس کا نتجہ ہے۔
 شاعری کی ابتداء میں نے ۱۹۵۵ء میں کی جب میں کالج کا طالب علم تھا۔
 ابتداء میں علامہ نجمہ آفندی سے شرف تلمذ رہا۔ علامہ نے مجھے شاعری کا سلیقہ
 بھی عطا کیا اور اس راستے پر چلنے کے لئے میری ذہنی تربیت بھی کی۔ علامہ کی رحلت
 کے بعد میں نے کسی کو بھی اپنا استاد نہیں بنایا۔ اس لئے جو کچھ بھی آپ کی خدمت
 میں پیش کر رہا ہوں میری اپنی فکر و کاوش کا نتیجہ ہے۔ البتہ مجھے میرے
 اپنے دوستوں سے قدم قدم پر جو مدد ملی ہے اس کے لئے میں ان کا مشکور ہوں۔
 ہم دوستوں کی بزم ”بزم فردوسِ ادب“ کا قیام تقریباً (۱۲) سال قبل ہوا

اب تک دوبار شائع ہو چکی ہے۔ دوسری اشاعت کی بھی اب صرف چند کاپیاں باقی ہیں۔ انگریزی میں دو اور کتابیں ”قطب شاہوں کی مذہبی پالیسی“ اور ”قطب شاہی دور کے صوفیائے کرام“ زیر طبع ہیں۔ ان کے علاوہ میں نے اب تک تیس قومی سمیناروں اور تین بین الاقوامی سمیناروں میں اپنے مقالے پیش کئے ہیں۔ حال ہی میں راس الخیمہ میں عرب ہند تعلقات پر منعقدہ بین الاقوامی سمینار میں میں نے ہندوستان کی نمائندگی کی اور مقالہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ یہ طویل مقالہ انگریزی اور عربی دونوں زبانوں میں شائع ہو رہا ہے۔ علمی زندگی کی ان مصروفیات کے باوجود میں نے اپنی مذہبی اور ادبی مصروفیات کو کبھی ترک نہیں کیا۔ پچھلے (۲۸) برس سے ذاکری کا شرف حاصل ہے۔ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کئی مجلسوں کو مخاطب کر چکا ہوں۔ کئی ادبی اور سماجی انجمنوں سے وابستہ ہوں۔ حیدرآباد کے مشہور ادارے ”بائے العلم سوسائٹی“ کا پچھلے (۱۲) سال سے سکریٹری ہوں اور ادارے کی سرپرستی میں نکلنے والے اسلامک ریسرچ جرنل ”دی نور“ کا پچھلے دس سال سے ایڈیٹر ہوں۔ یہ جرنل اب ساری دنیا میں صاحبانِ علم کی نظروں میں قابلِ قدر حیثیت کا حامل ہے۔ ادارہ نے اب تک (۷) کتابیں میری نگرانی میں شائع کی ہیں۔

حیدرآباد علمی تہذیبی اور مذہبی سرگرمیوں کے لئے مشہور ہے۔

ان ۱۲ برسوں میں ہم لوگ ایک خاندان بن گئے ہیں۔ روز ملتے ہیں تبادلہ خیال ہوتا ہے۔ علمی، ادبی اور شعری موضوعات پر کھل کر گفتگو ہوتی ہے۔ ایک دوسرے سے بھرپور استفادہ حاصل کیا جاتا ہے۔ یوں ہم ”فسر دوس ادب“ کے شعراء کا خاندان علمی راہوں پر کامیاب کامران آگے بڑھ رہا ہے اور اسی ماحول میں رہ کر میں اپنی تمام مصروفیات کے باوجود اپنی شاعری کو زندہ رکھے ہوئے ہوں۔

اس مختصر سے عرض حال کو ختم کرنے سے پہلے میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ میں اپنے سارے احباب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کروں جنہوں نے اس دور کشش میں علمی و ادبی ماحول تیار رکھا ہے۔ میں خاص طور سے جناب ابراہیم حاتی اور علامہ سہیل آفندی کا مشکور ہوں جنہوں نے مسودہ پر نظر ثانی کی زحمت گوارا کی میں اپنے دوست میرزا عادل نجفی کا کبھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بڑی محنت اور محبت سے اس مجموعہ کی کتابت فرمائی۔ میرے دوست علی ممتاز آرٹسٹ کا بھی میں شکر گزار ہوں جن کی فکر نے اس مجموعہ کے سرورق کی تخلیق کی ہے۔ جناب احسان عزیزی کا میں مشکور ہوں جنہوں نے پیش لفظ لکھ کر مجھے ممنون فرمایا۔

پیشِ گفتار

شعر اثرِ آفرینی اورِ معنویت سے عبارت ہوتا ہے۔ شعر کے لئے لفظوں کی تہذیب یا سجاوٹ ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ بات دل سے نکلے اور دل میں اتر جائے تو بات ہے۔ جس شعر میں یہ کیفیت ہو وہ شعر ہے ورنہ لفظوں کا مرتب ڈھیر ہے۔ شعر میں مکمل معنویت اور بھرپور تاثیر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر کو اپنے اطراف کی حقیقی جاگتی اور چلتی پھرتی زندگی کا گہرا ادراک ہو اور وہ روزمرہ کے واقعات کا شعوری سطح پر جائزہ لیتا رہے۔ اس کے نتائج کی سچائی اس کے اشعار میں خود اپنا رنگ بھرتی چلی جاتی ہے تب شعر شعر کہلاتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حسنِ خوش لباسی سے آزاد ہوتا ہے۔ حد یہ ہے کہ سادہ لباس بھی اس سے ہمو کر خوش لباسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ شعر میں لفظوں کی تہذیب کا یہی موقف ہے۔ اصل شے فکر کی صحت اور تجربہ کی صداقت ہے۔ سچائی کا اظہار چاہے جن لفظوں میں ہوا اثر رکھتا ہے۔ اظہار میں سلیقہ ہو تو سونے پر سپہاگ ہے مثلاً انقلابِ زمانہ کے اس ظہار کو دیکھئے۔

”کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے“

صرف دہموی لفظوں کی تکرار ہے لیکن تاثر اپنی جگہ برقرار ہے۔ زندگی کے بے ہنگم شور سے کرناک چخوں کو سٹینا نام ذہن کے پس کا روگ نہیں ہے۔ اس فرض کو وہی ذہن ادا کر سکتے ہیں جن کے قلب و دماغ نازک احساسات سے مملو ہوتے ہیں۔ زندگی کے تیز دھاروں کے تھپیڑے کھاتی ہوئی مجبور زندگیوں کے درد کو سمجھنا اور اپنے موثر اظہار سے دوسروں کو بھی اپنا شریک درد بنانا آسان کام نہیں ہے۔ اس راستہ کو وہی شاعر طے کر لیتا ہے جو اپنے سینہ میں دھڑکتا ہوا دل رکھتا ہے۔ دل سے جب ہوک اٹھتی ہے تو خود بخود ”آہ“ کی شکل میں ڈھل جاتی ہے۔ ابلاغ کی سچائی اور اس کا تاثر لفظوں کو خود بخود سمیٹ لاتا ہے۔ شاعر اسی اثر کے تحت انہیں ترتیب دے لیتا ہے۔ جب ہم کسی اچھے شعر کو سن کر بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں ”کیا بے ساختہ شعر ہوا ہے“ تو اس شعر کی تحلیل میں یہی دیکھتے ہیں کہ ایک تاثر ہے جو خود بخود لفظوں میں ڈھل گیا ہے۔ اصل شاعری یہی ہے۔

جہاں تک اسلوب کا سوال ہے وہ اس شاعر کی ذہنی اپج کا تابع ہوا کرتا ہے۔ ہر شاعر کے سوچنے کا انداز مختلف ہوتا ہے شعر کی پیکر تراشی اسی نسبت سے ہوتی ہے۔ کوئی سہل ممتنع ہوتا ہے تو کوئی مشکل پسند۔ اسلوب اسی طرز فکر و اظہار سے متعین ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں اور

صدائقوں سے جب شاعر کا ربط غیر منطقی ہو جاتا ہے تو فکر پچکولے کھانے لگتی ہے
 ایسی شاعری میں اسلوب ”لاعنیت“ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ صورت اس وقت
 پیدا ہوتی ہے جب شاعر اور اس کی شاعری دو الگ الگ خانوں میں بٹ جاتی
 ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاعر بھوک پر غمہ شعر کہہ سکتا ہے اس کے لئے یہ ضروری
 نہیں کہ خود اس نے کبھی بھوک کی اذیت سہی ہو۔ یہ بات درست ہے لیکن اس
 بھوک کی اذیت کا تعلق شاعر کے ظاہری پیکر سے نہیں ہے بلکہ اس پیکر کے
 اندر جو شاعر ہے وہ اس اذیت کو جانتا ہے اور بھوک پر اُسی اندر کے شاعر کا
 شعر ہوتا ہے۔ شاعر کا ظاہری پیکر تو صرف آلہ اظہار ہے۔ اچھی اور سچی شاعری
 وہیں ہوتی ہے جہاں شاعر اور شاعری دو خانوں میں تقسیم نہ ہو۔ جس ذات میں
 شاعر اور شاعری اکائی بن جاتے ہیں وہاں ”لاعنیت“ کی بے چہرگی نہیں ہوتی۔
 اثر و معنی کی وسعت شاعر کے تجربہ اور شائعہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے
 ان ساری باتوں کے تناظر میں جب میں ڈاکٹر صادق نقوی کی پھیلی ہوئی
 شخصیت کو سمیٹ کر شاعر کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں تو بڑی مشکل سے
 دوچار ہو جاتا ہوں۔ یہ مشکل اس لئے ہے کہ میں کھیل کے میدان کے صادق نقوی
 سے جامعہ عثمانیہ کے شعبہ تاریخ کے ریڈر صادق نقوی تک جانتا ہوں۔ نام سے تو
 وہ ہر جگہ صادق نقوی رہے لیکن جس میدان میں دیکھا اُسی میدان کے مرد کھاتی تھے۔

رہے، دوسری جگہ نظر نہیں آئے۔ میرے اس جملہ کے سمجھنے میں قاری کو تلاح ہو سکتا ہے میرا مطلب یہ ہے کہ اگر میں نے صادق نقوی کو فٹ بال کے کھلاڑی کے روپ میں دیکھا تو وہ فٹ بال ہی کے بہترین کھلاڑی نظر آئے۔ کرکٹ کے میدان میں دیکھا تو کرکٹ کے بہترین کھلاڑی دکھائی دیے۔ فٹ بال کے میدان سے اوجھل ہو گئے۔ کیڈٹ کا یونیفارم پہن لیا تو وہ اسمارٹ سپاہی نظر آنے لگے۔ میدانوں سے فاسٹ ہو گئے۔ علمی میدان میں قدم رکھا تو ایسا محسوس ہوا کہ اس شخص نے کبھی کھیل کے میدان میں قدم ہی نہیں رکھا۔ سدا کتا بوں سے رشتہ ناٹھ جوڑے رکھا۔ علمی گفتگو میں اپنے موضوع منطقی تسلسل کے ساتھ کتا بوں اور محظوظات کے حوالوں کی وہ بھرمار کہ سامع پریشان ہو جائے اور مرعوب بھی ہونے لگے۔ خطابت کے میدان میں ایسے منفرد مقرر کہ سارے مجمع سے اپنی بات منوا کر رہے۔ اپنی شیریں بیانی پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند کروا ہی لیتے ہیں لیکن کمال یہ ہے کہ اتنی تلخ نوائی پر بھی مجمع سے واہ واہ لیتے ہیں۔ ذاکر ایسے کہ دلوں کو تڑپا دیں۔ جس ذات میں اتنے اضداد جمع ہو جائیں اس کو سمیٹ لینا کتنا مشکل مرحلہ ہو گا۔

میں نے صادق نقوی پر سوچتے ہوئے ان کی صلاحیتوں میں اس قدر مشترک کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے گرد دوسری تمام قدریں

گھومتی ہیں جو ان کی صلاحیتوں کی صورت نگری کرتی ہیں۔ صادق نقوی کی ذات کو ٹٹول ٹٹول کر اور ان کے وجود کو کھنگال کھنگال کر جو قدر میں نے تلاش کی وہ ہے ان کا غم سے چھلکتا ہوا دل۔ اور یہ غم انہیں کربلا کی دین ہے صادق نقوی کی تکوین اسی غم سے ہوئی ہے وہ ایسے ماحول کے وارث ہیں جہاں آنکھ کھولی تو غم حسین کی روشنی دیکھی۔

غَم کی اس اعلیٰ قدر نے ان میں انسان دوستی، عزم، بہمت، استقامت، قوت برداشت، صبر و تحمل، سنجیدگی و متانت، غور و فکر، ارادوں میں اُبل رہنا، فیصلوں میں احتیاط برتنا، نامساعد حالات کے مقابل ڈٹ جانا، دوسروں کے غم کو باتل لیتا، ناگوار باتوں کو وہاں تک درگزر کر لیا جہاں تک "انا" پر حرف نہ آئے۔ دراصل یہی وہ صفتیں ہیں جنہوں نے صادق نقوی میں اچھی شخصیت اور سچے شاعر کی تشکیل کی ہے۔

صادق نقوی ایک شاعر ہیں۔ ایسے شاعر جو اپنے وجود کو شاعری سے الگ نہیں رکھتے۔ ان کا خود کہنا ہے کہ وہ پہلے شاعر ہیں اور بعد سب کچھ۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہی سب کچھ ایک ہوئے ہیں تو شاعر بنے ہیں۔ صادق نقوی کا اپنے گرد و پیش کا تجربہ وسیع اور تجزیہ بہت نازک ہوتا ہے۔ جب وہ شعر میں ڈھلتا ہے تو سامع یا قاری پہلے متاثر ہوتا ہے بعد میں اس شعر کے پردے میں چھپی ہوئی

گہری فکر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے

ساغر بن کر جن کی جوانی گردش کرتی رہتی ہے

اُن سے پوچھو کون سیہ راتوں میں کیونکر جلتا ہے

سماج کے اس گھناؤ نے پہلو کی کس بھر پور تاثر کے ساتھ نقشہ کشی کی ہے۔

شعر کہنے کے تعلق سے صادق نقوی نے اپنے نقطہ نظر کو اس طرح ظاہر کیا۔

یہ چند لفظ ہیں صادق کی شاعری تو نہیں

سنبھل گئے، سوچ کے جتنا تو شاعری ہوتی

خیرات ندیم مرحوم نے کہا تھا کہ :-

”لفظ تاک اڑالینا خوب استفادہ ہے“

آج کل متاعروں کی کھپ میں یہ جرم عام ہو چلا ہے کہ استفادہ کے نام پر

لفظوں کا سرکہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان پر ڈاکہ تک ڈالتے سے نہیں چوکتے۔

انیس علیہ الرحمہ کو تک کہنا پڑا تھا۔

لگا رہوں مضامین نو کے پھر انبار

خبر کرو مرے گلشن کے خوشہ چینوں کو

غالباً صادق نقوی بھی اس تلخ و ناگوار تجربہ سے دوچار ہوئے تھے انہوں

نے دو اور دو چار کی طرح صاف صاف کہہ دیا اور لہجہ کی تلخی کو کم کرنے پر

آکادہ نہیں ہوئے ۔

تقسیم کر رہا ہوں میں اپنی متاعِ فکر

نسلِ فقیر زادوں کو خوشحال دیکھنے

سماج کی طبقہ واری کشمکشِ مُسلم ہے ۔ وہ طبقے کتنے قابلِ رحم ہوتے

ہیں جن کے افراد حالات کی ضربوں سے چکنا چور ہو کر وقت سے پہلے ضعیف

ہو جاتے ہیں : ”ہم تو بچپن سے بڑھاپے میں قدم رکھتے ہیں

غم نصیبوں کی جوانی کو جوانی نہ کہو“

کون نہیں جانتا کہ حق بات کہنا کتنا تلخ ہوتا ہے ۔

یہ سوکھے زرد پتوں کی کہانی کون لکھے گا

قلم کس کا ہے اتنا معتبر یہ دیکھنا ہوگا

وائے برقعِ زبان و علم و دانشِ فکر و فن

معتبر کوئی بھی دانشور یہاں ملتا نہیں

شعلے، سورج، سیخ، صحرا، ببول، سوکھے زرد پتے، کانٹے، پیکس، تشنگی،

کربلا، سوکھے پھول، تاریخ، صادق نقوی کے خاص استعارے ہیں ۔ وہ

ان استعاروں سے بھرپور مفہوم کو ادا کر دیتے ہیں ۔

”شعلوں کے دریا نعتی گلشن کی آبرو بخشتی ہوئی زمیں پہ چلتے رہے ہیں پھول

سو کھٹے ہوئے ببول کے سایہ میں بیٹھ کر
 گرمی سے دیکھیں آج سُلگتا ہے کون کون
 جوشنگی میں سمندر کا ظرف رکھتا تھا
 اُسی کی راہ پہ چلتا ہے کارواں اپنا
 وہ شخص جس کی لاش تھی صحرا کے دریاں
 دریا کا ظرف رکھتا تھا لٹنے لپی کے ساتھ

صادق نقوی نے اپنے اسلوب کے تعین کے لئے سب سے پہلے ”روشن لکیریں“
 کھینچیں۔ ان روشن لکیروں میں ایک لکیر غزل کی سمت سے چلی آئی۔
 دوسری ”جذیبہ صادق“ کی سمت سے۔ جب یہ دونوں روشن خطوط ایک
 نقطہ پر ملے تو اب جو زاویہ بنے وہ دو ہیں۔ ایک روشن زاویہ وہ ہے جو
 غزل کی سمت بڑھتا جا رہا ہے اور دوسرا وہ جو مذہبی شاعری کی سمت
 متحرک ہے غالباً انہوں نے اسی استعارے کو یہی مفہوم دے کر ”روشن زاویہ“
 نام رکھا ہے۔

روشن زاویے غزلوں، نظموں اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ کلام
 صادق نقوی کے اسلوب فکر اور ان کے لفظیات، استعاروں کو متعین کر دیتا ہے
 صادق کالم و لہجہ ترقی پسند ادب اور جدیدیت کے درمیان بہت

متوازن ہے اسی لئے ان کا کلام سب کو مطمئن کرتا ہے۔ وہ پابند شاعری کے پابند ضرور ہیں لیکن نئے تجربوں کے مخالف بھی نہیں ان کی آزاد نظمیں اس کا ثبوت ہیں۔

صادق نقوی کی آزاد نظمیں زیادہ تر فلسفیانہ فکر کی حامل ہیں وہ اس میدان میں بھی پابند شاعری کے اس طرح پابند ہیں کہ کھڑے مصرعے کسی بحر کے ارکان کو کم یا زیادہ کر کے مرتب کرتے ہیں۔

روشن زاویے زندگی کے مختلف زاویوں کو متاثر کن اور منطقی ربط کے ساتھ روشنی میں لاتے ہیں۔ مثالوں سے گریز کرتے ہوئے آخر میں ایک بابا عرض کرنا چاہوں گا وہ یہ کہ کامیاب شاعری کے لئے دو لکیروں کا ایک نقطہ پر مرکوز ہونا ضروری ہوتا ہے ایک لکیروہ ہے جو بیان سے تعبیر کی جاتی ہے۔ دوسری لکیروہ جو خیال کے سفر کو متعین کرتی ہے۔ جب یہ دونوں خطوط سچائی کے مرکز سے ظہور پذیر ہوتے ہیں تو روشن زاویے وجود میں آتے ہیں۔

صادق نقوی نے جن روشن زاویوں کی تجسیم و تکوین کی ہے ان کا مرکزی نقطہ سچائی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے اظہار میں سلاست اور خیال میں منطقی معنویت ہے۔ نیز سچائی کی رعنائی

ہر ایک روشن زاویے کی وسعت پر چھائی ہوئی ہے۔
 مجھے اس کے آگے اور کچھ کہنا نہیں ہے کیونکہ
 ”عطر خود بگوید“

یقین ہے کہ روشن زاویے کی تمام ادبی حلقوں میں ہر زاویہ
 سے پذیرائی ہوگی۔ دعا ہے۔
 ”اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ“





سکوتِ شب کی تنہائی میں جو ہر بات کرتے ہیں
تمہارا ذکر ہوتا ہے تو پیچہ ربات کرتے ہیں
ہمیں خاموش نظروں کی زباں پڑھنا نہیں آتا
ہماری آنکھ کے آنسو بھی اکثر بات کرتے ہیں
یہی تاریخ ہے قانون ہے حق کی روایت ہے
زبانیں روک دی جائیں تو خنجر بات کرتے ہیں
ہوں محو خواب آنکھیں گرتی سمجھانے سے کیا حاصل
صدف کی آنکھ کھلتی ہے تو گوہر بات کرتے ہیں
جو قدموں میں رہیں تو آفتابِ صوفیاں ہونگے
تھیلی پر جو آجائیں تو کنسکریات کرتے ہیں

پلٹ جاتے ہیں ساحل سے جو طوفانوں کے متوالے
 تو کشتی دم بخود رہتی ہے سنگربات کرتے ہیں
 اگرہوں ہاتھ میں پتھر تو شیشے کے مکانوں سے
 نکل کر خون کے پیا سے سنگربات کرتے ہیں
 جہاں بھی بات آئے حق پسندوں کے مسائل کی
 تو ہم صادق بڑی جرات سے اکثر بات کرتے ہیں



سنگ مرمر میں ڈھلی کوئی غزل ہو جیسے
 رودِ جہنا پہ کوئی تازہ کنول ہو جیسے
 ایسے سوتا ہوں میں اوڑھے ہوئے خالوں کی ردا
 میرا مٹی کا مکان تاج محل ہو جیسے



زباںِ خنجر کی کھلتی ہے ہنرِ خاموش رہتے ہیں
 لہو کا سینہ برستا، بشرِ خاموش رہتے ہیں
 سکوتِ شب کی تنہائی میں جانے کون آتا،
 فضا میں بول اٹھتی ہیں شجرِ خاموش رہتے ہیں
 کبھی افلاسِ غربت، تنگدستی چنچ اٹھتی ہے
 کبھی ظلم و ستم کی زد پہ گھرِ خاموش رہتے ہیں
 مروت کی فضاؤں میں کبھی ایسا کبھی ہوتا ہے
 جس پریل تو آتے ہیں مگر خاموش رہتے ہیں
 ہمارا درد بچوں کی زباں سے چنچ اٹھتا ہے
 مگر گرتے ہوئے دیوار و درِ خاموش رہتے ہیں

لکھن ابوں کے پتھر بات کرتے ہیں مسافر سے
 مکی پہلو میں بیٹھے ہم سفر خاموش رہتے ہیں
 بس اک سرتھابن کے کٹکے بھی پڑتار اُترا
 وگرنہ جسم سے کٹ کر تو سر خاموش رہتے ہیں
 سنو کر دار پر چڑھتی ہے بیٹی جب بھی مفلس کی
 تو صادق صاحبانِ سیم و زر خاموش رہتے ہیں



قطع

یہ پھول کی پتی پہ بنائے ہوئے چہرے
 دریاے محبت میں نہائے ہوئے چہرے
 حالات کے سورج کی تازت سے جلے ہیں
 برفاب چٹانوں پہ سجائے ہوئے چہرے



رہتا ہوں سمندر میں مگر پیاس لگی ہے
 بادل کے برسنے کی بڑی آس لگی ہے
 چھوٹوں کے ہے چہرے پہ ندامت کا پسینہ
 کیا میرے چین کو تری بو یاں لگی ہے
 خاموش لگا ہوں میں ہے حالات کا شکوہ
 ٹھہرائی ہوئی قوتِ احساس لگی ہے
 وہ شب کی سیاہی سے نکلتا ہوا سورج
 وہ دور کی سوغات بڑی پاں لگی ہے
 لکھا ہے فسادوں کی کہانی کو لہو سے
 گرتی ہوئی دیوار کبھی قرطاس لگی ہے

بستی بھی مری گھر بھی مرا لوگ بھی میرے
 لیکن مری دنیا مجھے بن یا اس لگی ہے
 بس خشک سے ہنٹوں پہ باں پھیری اس نے
 وہ کہہ نہیں سکتا تھا مجھے کیاں لگی ہے
 صادق یہ سیہ خانہ افکار میں آ کر
 بونوں کو بلندی کی بڑی آس لگی ہے



کتنے دلکش مقام آتے ہیں
 تیری آنکھوں میں ڈوب جاتے ہیں
 یوں بھی ہوتا ہے میری دنیا میں
 لوگ پھولوں سے چوٹ کھاتے ہیں



تو میں ہو رہی ہے صداقت شعار کی
 پستی سے دیکھتے ہیں بلندی وہ دار کی
 سینے کے زخم، دھوپ، یہ تپتی ہوئی زمیں
 ہر چیز بے رہی ہے دہائی بہار کی
 بس ایک بار آپ نے دیکھا تھا بزم میں
 بدلی نہیں ہے آج بھی صورت خمار کی
 دنگا، فساد، خون، ستم، دردِ لادوا
 تاریخ لکھ رہا ہوں ترے اختیار کی
 بچے ہمارے صاحبِ کردار ہو گئے
 کرتے نہیں ہیں بات سکون و قرار کی

وہ لوگ جن کا نام تھا تہذیب کی مثال
 باتیں وہ کر رہے ہیں غم روزگار کی
 خنجر چھپا پھرتے ہیں احباب آجکل
 بدلی ہوئی فضا ہے محبت کی پیار کی
 سوکھے ہوئے ببول کے سائے میں بیٹھ کر
 منطوم کر رہا ہوں کہانی بہار کی
 پیاسے بدن سے خون کا دریا تھا موجزن
 رنگیں ہو گئی تھی زمیں کارزار کی
 وہ شخص جس کے جسم پہ زخموں کی تھی ردا
 تعریف کر رہا تھا وہ پروردگار کی
 صادق ہو کہنے والا محبت کی بات ہو
 صورت یہی ہے ایک فقط اعتبار کی



آنکھوں میں تشنگی تھی مکمل شباب تھا
 وہ دن گئے کہ اپنا پسینہ گلاب تھا
 دارالمطالعہ تھا یہ شہر وفا کبھی
 اس شہر میں ہر ایک کا چہرہ کتاب تھا
 چونکا تو ایک نور کا دریا تھا سامنے
 دیکھا تو دو قدم پہ مرے آفتاب تھا
 وہ جس کے ہاتھ پھول کی پتی سے کر ڈگئے
 بنجاروں کی نظر میں بڑا کامیاب تھا
 کیچر کے پھول اونچے مکانوں میں جا بے
 میرے نگر میں ایک ہی انقلاب تھا

وہ جس کی فکر چاند سارے سمیٹ لے
 اپنے ہی گھر میں دفن وہ خانہ خراب تھا
 لکھا ہے اُس نے خون سے پتھر کے فرش پر
 قاتل بھی میرے دور میں عزت مآب تھا
 صادق تھا جس کا نام اُسے جانتے تھے لوگ
 وہ بھی صداقتوں کے صحیفے کا باب تھا



قطعہ

مرتب سے عاجزی سے دعا مانگتے ہیں لوگ
 اپنے غم و الم کی دوا مانگتے ہیں لوگ
 تنجر سے لکھ رہے ہیں وہ مہن و اماں کی بات
 بہتے ہوئے لہو کا صلہ مانگتے ہیں لوگ



زندگی دیکھ کے موجوں کی روانی نہ کہو
 میں بہل جاؤں گا ماضی کی کہانی نہ کہو
 پیاس انسان کا لہو پی کے کہاں بجھتی ہے
 خون کی پیاس کو تم تشنہ دہانی نہ کہو
 ہم تو بچپن سے بڑھاپے میں قدم رکھتے ہیں
 غم نصیبوں کی جوانی کو جوانی نہ کہو
 کبھی پانی سے بھی جل جاتا ہے پھولوں کا شبا
 زندگی دے نہ سکے جو اسے پانی نہ کہو
 میں تو لفظوں کی حرارت سے بھی جل جاتا ہوں
 واقعہ جو بھی ہوا اپنی زبان سے کہو
 بات صادق کی کتابوں میں لکھی جاتی ہے
 جھوٹ کو سچ نہ کہو سچ کو کہانی نہ کہو





تلاشِ تیر و غالب اس جہاں میں
 بہاریں ڈھونڈھتا ہے کیوں خزاں میں
 نہ لفظوں کا تسلسل اور نہ آواز
 صدا دیتا ہوں آنکھوں کی زباں میں
 وہی اک نام ہے جس کا تسلسل
 اشارہ بن گیا ہے داستان میں
 یہ منظر دیکھ کر روتا رہا ہوں
 ہے پھولوں کا جنازہ گلستاں میں
 یہ چودہ سو برس سے کہہ رہا ہوں
 ”جواب اُن کا نہیں دونوں جہاں میں“
 مری وحدت پرستی اللہ اللہ
 سہارا ایک ہے دونوں جہاں میں
 جو حق کی بات ہوتی ہے تو سہم
 کبھی جاتی ہے صادق کی زباں میں



دل کی آواز ہے آنکھوں سے نکلتا پانی
 داستانِ غم و آلام ہے بہتا پانی
 ایک دریا ہے سمندر ہے مری تشنہ لبی
 ڈھونڈتا پھرتا ہوں صحرا میں برساتا پانی
 کوئی پتھر کبھی پانی میں نہ پھینکا جائے
 ایک شیشے کی طرح ہوتا ہے ٹھہرا پانی
 دل کے دروازے دستک کی صدا دیتا ہے
 ان کی آنکھوں کے کٹوروں سے نکلتا پانی
 شعلہ طور کے مانند اثر رکھتا ہے
 میرے دامن پہ مری آنکھ سے بہتا پانی



جلتا رہا ہوں گہرِ دُشِ ایام کے قریب
 بھڑکا ہوا دیا ہوں میں انجام کے قریب
 وہ شخص اس اندھیرے مکاں میں گزر گیا
 سورج تراش تارا جو شام کے قریب
 لکھا ہے کوئلہ سے کسی نے مرا کھجی نام
 تیرے مکاں کے در پہ تیرے نام کے قریب
 مٹی کے برتنوں کی سبائی گئی دکاں
 پتھر کے سائبان تلے شام کے قریب
 سورج کی فصل بو کے اندھیرے گھاؤں میں
 بیٹھا ہوا ہوں حسرتِ ناکام کے قریب
 صادقِ جواں رات چلو میکدہ چلیں
 جھوٹی روایتوں سے پرے جاؤں کے قریب





آکے دل میں نگاہوں میں نظر آئے گا
 چڑھتا سورج ہے اُجالوں میں نظر آئے گا
 بھول جانا تجھے فطرت سے بغاوت ہوگی
 حُسن بن کر تو نگاہوں میں نظر آئے گا
 غم چھپاؤ گے تو چہرے پہ ملال آئے گا
 درد آنکھوں کے دیرچوں میں نظر آئے گا
 کتنی بنجر سی زمینوں پہ چلا ہوں تنہا
 پھوٹتے پاؤں کے چھالوں میں نظر آئے گا
 ظلم تاریخ کے پردے میں کہاں چھپتا ہے
 ظلم بوسیدہ کتابوں میں نظر آئے گا
 ڈھونڈتے پھرتے ہو صادق کو کہا بستی میں
 جاؤ دیکھو وہ غزالوں میں نظر آئے گا





خشک پتوں کی زباں کا راز داں کون آگیا
 میرے حصے کی زمیں پر باغباں کون آگیا
 دفن ہے جس دس میں تہذیب کا ننگا بدن
 رات کے پچھلے پہر شاعر وہاں کون آگیا
 کھٹکھٹا ہے کوئی دروازہ جب بھی رات میں
 سوچتا ہوں اس اندھیرے میں یہاں کون آگیا
 ہم تو چہروں کی زباں پڑھتے ہیں ان کی دھوپ میں
 ہم سے پوچھو کس کی آنکھوں میں کہاں کون آگیا
 خوبصورت لفظ بھی کہنے لگے بازار میں
 جاؤ دیکھو تو یہاں اہل زباں کون آگیا



زندگانی کا سفر ہے ایک دن اور ایک رات
 یہ کہانی مختصر ہے ایک دن اور ایک رات
 یہ بلندی کا تصور رنگ و نہایت جھوٹ ہے
 شاخ پر رہتا ثمر ہے ایک دن اور ایک رات
 اُن کے چہرے کی دمک اور اُن کی زلفوں کا رچاؤ
 معجزہ پیشِ نظر ہے ایک دن اور ایک رات
 ساتھ تو دونوں چلے ہیں میں بھی او میر انصیب
 کون جانے رُخ کدھر ہے ایک دن اور ایک رات

میں کبھی ہوں نظروں کے آگے میرا مستقبل بھی ہے
 دیکھ لیجے در بدر ہے ایک دن اور ایک رات
 پارسائی بھی نہ جائے میکشی کے ساتھ ساتھ
 کس دور ہے پریشہ ہے ایک دن اور ایک رات
 ساتھ صادق کے رہی ہے گردشِ دوراں مگر
 فرق اب بھی معتبر ہے ایک دن اور ایک رات

قطعہ

اپنی تہذیب کی روداد بدل جاتی ہے
 دل دھڑکتے ہیں محبت بھی محل جاتی ہے
 جب کسی درد کے مار کا لہو بہتا ہے
 چار میستار کی بنیاد دہل جاتی ہے



میرے صبر و قرار کی تاریخ
 ہے ترے انتظار کی تاریخ
 خشک پیروں کے سائے میں بیٹھا
 لکھ رہا ہوں بہار کی تاریخ
 ایک گلی میں لکھ کے چھوڑی ہے
 گل کی پتی پہ خار کی تاریخ
 دیکھ ڈالے کئی کتب خانے
 دھونڈھتا اعتبار کی تاریخ
 تو نے نظریں اٹھا کے دیکھا تھا
 میں نے پڑھ لی خمار کی تاریخ

تیرے نقشِ قدم سے بنتی ہے
 ہر حسین اعتبار کی تاریخ
 لوگ چہروں پہ آج پڑھتے ہیں
 درد کی غم کی 'دار' کی تاریخ
 ظلم 'خوں ریزی' جنگ اور فساد
 آپ کے اختیار کی تاریخ
 ظلمتوں کے سیاہ خانے میں
 کون لکھے گایار کی تاریخ
 آپ صادق کو کیا سمجھتے ہیں
 اُس نے لکھی ہے پیار کی تاریخ



اے آبروئے جوشِ جنوں مدعانہ مانگ
 یہ زخمِ کائنات ہیں ان کی دوانہ مانگ
 گلشنِ کوخون دے کے رہے سُرخرو جنوں
 بہتے ہوئے لہو کا کسی سے صلہ نہ مانگ
 یہ زندگی ہے کشمکشِ بہت و بود سے
 اسِ دورِ کشمکش میں سکوں کی فضا نہ مانگ
 اے باغبانِ گلشنِ تو یہ فضول ہے
 کانٹوں کی فصلِ بوکے گلوں کی دُعا نہ مانگ
 میں اپنے بچپن کو سمجھتا ہوں خود دلیل
 مجھ سے کوئی دلیلِ خدائے وفانہ مانگ

تقسیم کر رہا ہوں میں دولت خلوص کی
 وہ یہ بتا رہے ہیں کہ کیا مانگ کیا نہ مانگ
 صادق و فنا کے باب میں تیرا بھی نام ہے
 اس مصلحت نواز جہاں سے وفانہ مانگ



قطع

ہر شخص کے ماتھے پہ سیدہ رات لکھی ہے
 پھولوں کی گذرگاہ بھی کانٹوں سے سجی ہے
 اس دور میں تاریخ کی بنیاد بدل دو
 یہ خون سے لکھی ہے اجالوں میں چلی ہے



کتنا آسان بنا دیتے ہیں فرمانِ حیات
 گرتی دیوار پہ لکھ دیتے ہیں عنوانِ حیات
 وقتِ شیشہ کے مکانوں کو گرا دیتا ہے
 صاف لفظوں میں یہ ہوتا رہا اعلانِ حیات
 ہم جہاں رہتے ہیں تہذیبِ عالمی ہے
 اپنے اخبار میں لکھ دیکے یہ فرمانِ حیات
 احتراماً تجھے القاب لکھا کرتا ہوں
 ورنہ اس شہر میں کوئی نہیں سلطانِ حیات
 جن کے چہروں پہ لکھا ہے کہ پریشان ہیں وہ
 محفلِ شعر میں ہوتے ہیں غزلخواںِ حیات

اب تو بچوں کو کھلونے بھی نہیں دے سکتے
 پھر بھی جی لیتے ہیں ہم لوگ بہ عنوانِ حیات
 ایک دو، شعر کے مجموعے، قلم اور کاغذ
 آج کے دور میں شاعر کا ہے سامانِ حیات
 یہ عنایت ہے کہ کچھ لوگ ابھی باقی ہیں
 جن کی نظروں میں ہے صادق ہی باںِ انِ حیات



قطع

میں ٹوٹ کے بہتا ہوا دریا تو نہیں ہوں
 صحرائے تمدن کا اجالا تو نہیں ہوں
 حالات کا پتھر اوڑھے مجمع میں کھڑا ہوں
 فولاد کا جوہر ہوں میں شیشہ تو نہیں ہوں



میری آنکھوں نے چُن لئے کانٹے
 پھول کے پاس ہی ملے کانٹے
 میں بھی ایسا ہی ایک ہی ہوں
 پاؤں میں جس کے چبھ گئے کانٹے
 کون جانے چین پہ کیا گزری
 خون میں تر بہ تر ملے کانٹے
 اُن کے دامن سے میرے دامن تک
 پھول ہیں اور مل گئے کانٹے
 ایک ایسا بھی دُور آیا ہے
 خوبصورت لگے مجھے کانٹے

سوچتا ہوں کہ مصلحت کیا ہے
 پھول مڑجھا گئے کھلے کانٹے
 میں نے صادق چمن سنوارا ہے
 خون پی کر مرا پلے کانٹے



قطعہ

یہ کس کا گھر جلا ہے کوئی جانتا نہیں
 کیسے دھواں اٹھا ہے کوئی جانتا نہیں
 اک لاش ہے غریب کی کب سے پڑی ہوئی
 یہ کون مر گیا ہے کوئی جانتا نہیں



رات گزری تو شہیدانِ وفا بھی آئے
 اوڑھ کر جسم پہ زخموں کی ردابھی آئے
 دھوپ آنکھوں میں جو چھپنے لگی نشتر کی طرح
 کھڑکیاں کھول کے رکھنا کہ ہوا بھی آئے
 میں سرِ شام ہی سو جانا ہو بچے کی طرح
 پاس اگر گردشِ ایامِ بلا بھی آئے
 رنگ سے حُسن کا رشتہ ہے ترایوں مضبوط
 نام لکھوں جو تر از رنگِ حنا بھی آئے
 یہ روایت ہے دھن کی اسے زندہ رکھنا
 مسکراتے ہوئے ملنا جو قضا بھی آئے
 یہ تو لفظوں کے کھلونوں کی دُکّاں لگتی ہے
 اس غزل میں مرے بچوں کی صدا بھی آئے
 کیو لکھو دل کے فسانے کا خلاصہ صادق
 اپنے قاتل کے لئے حرفِ دعا بھی آئے



وہ شخص جو تلوار کے سائے میں کھڑا ہے
 اُس شخص کے ہونٹوں پہ پیسبر کی دعا ہے
 ہے جس کے تصرف میں یہ چڑھتا ہو اسوج
 وہ ڈوبتے سورج کا پتہ پوچھ رہا ہے
 بس ایک ہی تحفہ ہے ترے پیار کا باقی
 دیوار پہ سرخی سے ترانام لکھا ہے
 کشتی کو حقارت سے مری دیکھنے والے
 تو بھی تو سمندر کے کنارے پہ کھڑا ہے
 جو طہنر کے نشتر سے لگایا تھا کسی دن
 وہ زخم مرے دوست ابھی تک بھی ہر آہ
 لفظوں کے لبادے میں ہے اخلاص کی دلوت
 ہونٹوں پہ بھی قاتل کے لئے حرفِ دعا ہے
 صادق یہ ہمالہ کی بلندی کا تصور
 میری ہی بلندی نے زمانہ کو دیا ہے



زندگانی سنوار کر رکھ دو
 یہ لبّادہ اتار کر رکھ دو
 کچھ تو ہوتھپھروں کی بستی میں
 ایک گلشن نکھار کر رکھ دو
 اب تعارف کی کیا ضرورت ہے
 اپنا چہرہ اتار کر رکھ دو
 اب تو چہروں کو پڑھ کے لکھنا ہے
 یہ کتا ہیں سنوار کر رکھ دو
 کس کو درکار ہے غمِ دوراں
 ہر گلی میں پکار کر رکھ دو
 یہ دور روزہ حیات ہے صادق
 جس طرح ہو گزار کر رکھ دو





کبھی ماضی میں لوٹو گے تو درِ دلادوا ہوگا
 زبان کا زخم ہے جتنا چھپاؤ گے ہر اہوگا
 میں لفظوں کے سمندر سے یہ موتی ڈھونڈ لایا ہوں
 لہا دوں گا تری محفل میں جب بھی سامنا ہوگا
 جب آؤ گے تو گلشن کی بہاریں جا چکی ہوں گی
 یہ مانا آپ کا وعدہ بہر صورت وفا ہوگا
 یہ ٹوٹے جام، بہتی سے قیامت کا یہ سناٹا
 یہ میخواروں کی محفل میں نہ جانے کیا ہوا ہوگا
 یہ سوکھے زرِ دیتوں کی کہانی کون لکھے گا
 قلم کس کا ہے اتنا معتبر یہ دیکھنا ہوگا
 میں صادقِ عظمتِ تاریخ کی یا نہ ہوں جیتا ہوں
 مجھے محسوس ہوتا ہے کہاں کیا واقعہ ہوگا





یہ بھی ہے حادثہ مری یونگی کے ساتھ
 بے چہرگی کا درد ہے لیکن خوشی کے ساتھ
 مالک دعا کو ہاتھ اٹھاتا ہوں اس لئے
 تیرے کرم کی آس ہے زندگی کے ساتھ
 چہرہ کھلی کتاب ہے خطاطِ وقت کا
 نظروں میں ہو شعور اگر روشنی کے ساتھ
 اک پھول جس کے ساتھ ہے خوشبو کا قافلہ
 کھرے میں رکھ گیا ہے کوئی سادگی کے ساتھ
 وہ شخص جس کی لاش ہے صحرا کے دریاں
 دریا کا طرف رکھتا تھا تھلا تھلا لہی کے ساتھ
 صادق صداقتوں کے اُجالے کی بات ہو
 لیکن یہ شرط ہے کہ ہے شاعری کے ساتھ





تری نگاہ کی مستی شراب جیسی تھی
 مرے مزاج کی حالت شباب جیسی تھی
 میں تیری دید کے آگے نہ بڑھ سکا ورنہ
 ترے بدن کی کہانی کتاب جیسی تھی
 نظر اٹھائی مگر تجھ کو دیکھ بھی نہ سکا
 کہ تیرے رخ کی ضیا آفتاب جیسی تھی
 مری نظر کا تقاضہ سوال جیسا تھا
 تری نگاہ کی شوخی جواب جیسی تھی
 وہ ایک پیار کا لمحہ جو ساتھ گزرا تھا
 اُس ایک لمحہ کی قیمت حباب جیسی تھی
 سمجھ سکا نہ زمانہ کبھی مجھے صادق
 مری ہنسی بھی مکمل نقاب جیسی تھی





وقتِ تھم کر دیکھتا ہے شانِ فرمانِ حیات
 لکھ رہا ہوں ریت پر تفسیرِ عنوانِ حیات
 ہم تو پتھر کے جگر رکھتے ہیں لوہے کے بدن
 ہم سے ٹکرا کر پلٹ جاتے ہیں طوفانِ حیات
 آپ کی شائستہ نظروں سے سلیقہ مانگ کر
 ہم سجا لیتے ہیں تنہائی میں ایوانِ حیات
 امن کی سرخی لگا کر یہ خبر چھاپی گئی
 پھر غریبوں کا لہو مانگے ہے دامنِ حیات
 کر رہا ہوں یہ غزلِ مشوب تیرے نام سے
 اے غموں کی دھوپ میں پلتی ہوئی جانِ حیات

ایک مجموعہ غزل کا کچھ کتابیں اک قلم
 آج کے شاعر کا ہے اتنا ہی سلمانِ حیات
 سوچتا ہوں تجھ کو کیا کہہ کر پکاروں بزم میں
 زرد پھولوں کی جوانی طرفِ نگرانِ حیات
 خنجروں کی زد پہ صادقِ پیار کی باتیں کرو
 یہ وفاداری کا مسلک ہے یہ اعلانِ حیات



قطعہ

شدتِ غم سے جو ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہے
 تیری تصویرِ نگاہوں میں چلی آئی ہے
 یاد آتا ہے ترا چاندنی راتوں سا بدن
 چاند دیکھا ہے تو آنکھوں میں نمی آئی ہے



کچھ اتنی بھیر تھی جسموں کی راستہ نہ ملا
 میں چہرہ چہرہ پھرا کوئی رہنما نہ ملا
 وہ لوگ چاند ستاروں کی بات کرتے ہیں
 جنہیں زمین کی وسعت کا کچھ پتہ نہ ملا
 یہ زرد سوکھے ہوئے پھول جیسے چہرے ہیں
 جنہیں بہارِ حین کا کوئی صلہ نہ ملا
 چلو کہ زر کو خدا ہم بھی مان لیتے ہیں
 مگر یہ غم تو رہے گا ہمیں خدا نہ ملا
 میں آگ آگ ہوں شبنم سے کیا بجھاؤ گے
 میں صحرا صحرا چلوں گا جو مدعا نہ ملا

سنا ہے دور کہیں کوئی شخص رہتا ہے
 جسے لہو کی تجارت کا کچھ صلہ نہ ملا
 مجھے تلاش کرو پتھروں کے سینے میں
 مرے وجود کا تم کو اگر پتہ نہ ملا
 میں تیرے حسن کو اپنی نظر بھی دیدوں گا
 نرے قریب جو آنے کا آگ بہا نہ ملا
 بہت قریب سے پازیب کی صدا آئی
 نظر اٹھائی تو اپنا مجھے پتہ نہ ملا
 بس ایک دم ہے صادق جیسا کچھ بھی نہیں
 خدا کا شکر کرو تم کو مرتبہ نہ ملا





صداقتِ غم و آلام ہے بیاں اپنا
 بھڑکتی آگ کے شعلوں میں ہے مکاں اپنا
 یقین آگے وعدوں پہ آگیا لیکن
 عجیب بات ہے دل خود ہے بدگماں اپنا
 وہ ٹوٹا ہوا لمحہ ہے بہتا دریا ہے
 جسے حیات نے سمجھا ہے راز داں اپنا
 میں انقلاب کے نقشِ قدم ابھاروں گا
 اگر حیات کو ترسے گا کارواں اپنا
 اسے خیال کی لغزش کہو کہ اہلِ جہاں
 سمجھ رہے ہیں سہارا ہے آسماں اپنا

زمیں سے تابہ فلک روشنی کا دھارا ہے
 ہمیں یقین ہے چلتا ہے آشیاں اپنا
 جہیں کو شوق ہے سجدوں کا دل کو ذوقِ نماز
 مگر یہ شرط ہے دکھلا دو آستیاں اپنا
 جو تشنگی میں سمندر کا طرف رکھتا تھا
 اُسی کی راہ پہ چلتا ہے کارواں اپنا
 وہ جس نے سرحدِ ظلم و ستم کو کاٹا تھا
 زبانِ خلق تھا صادق وہ بے زباں اپنا





بول سکتا ہوں مگر احساس دامنگیر ہے
 میرا اندازِ تکلم خود مری زنجیر ہے
 آپ آئے پاس بیٹھے بات کی رخصت ہو
 سوچتا ہوں خواب ہے یا خواب کی تعبیر ہے
 ٹوٹی سانسوں کا دریا بہتی سانسوں کا مزاج
 اے فسانہ سازِ ہستی یہ مری تقدیر ہے
 دیت کی دیوار کے سائے میں کٹتی ہے جیات
 کس قدر روشن ہمارے خواب کی تعبیر ہے
 لفظ سوکھے زرد پتوں کی طرح بکھرے مگر
 ان کو پھر بھی ناز ہے سلجھی ہوئی تقریر ہے

کوئی آئے گا جہاں میں صلح کا پیغامبر
 رات کے ماتھے پہ یہ لکھی ہوئی تحریر ہے
 اے سمندر کے خدا اگر تباہوں شبنم کا سوال
 دھوپ ہے صحر کی میر پاؤں میں زنجیر ہے
 معجزہ کہتے ہیں اس کو حسن کا اہل نظر
 بدلیوں میں چاند ہے کھلی ہوئی تنویر ہے
 موت کی باتوں میں مجھ کو آ رہا ہے یہ خیال
 چمکیا ہیں موت کی یا لوتی زنجیر ہے
 لکھ رہا ہوں پھر نئے انداز سے اپنی غزل
 لفظ تو صادق وہی ہیں پر نئی تفسیر ہے





دیکھنے والوں کا انداز بدلتا کیسے
 کھوٹا سکہ بھلا بازار میں چلتا کیسے
 قتل لفظوں کے بھی خنجر سے ہوا کرتا ہے
 ورنہ تقریر کی صورت میں وہ ڈھلتا کیسے
 ظلم اور خون کے بادل تھے چمن پر چھپا
 ان فضاؤں میں شجر پیار کا پھلتا کیسے
 غم اگر دل میں نہ ہوتا تو تری محفل میں
 درد آنکھوں کے کٹوروں سے اُلتا کیسے
 میرے افلاس نے مجبور کیا تھا ورنہ
 عید کے دن مرا معصوم مچلتا کیسے

آبلہ پانی تری عظمت و سمیت کے نثار
 خاواروں پہ میں اس شان سے چلتا کیسے
 علم کی راہ پہ میں بھی ہو چرائیوں کی طرح
 ورنہ اشعار کے فالوس میں جلتا کیسے
 ایک اُس نام کا صدقہ ہے وگرنہ صادق
 ٹھوکریں کھا کے زمانے میں سنبھلتا کیسے



قطعہ

چراغ آندھیلوں میں جلاؤ تو جانیں
 غم زندگی بھول جاؤ تو جائیں
 ہوسرتوں کا نگاہوں میں بھر کر
 ہماری طرح سکرادو تو جانیں



دل میں تمہاری یاد کے جذبے چل گئے
 پھر لفظِ احتیاط کے معنی بدل گئے
 دیکھا ہے ہر دکان کا شتو کیس بار بار
 ہم اپنی آرزوؤں کے سایہ میں پل گئے
 گرتے بھی ٹوٹتے بھی تڑپتے بھی راہ پر
 اک نام آگیا جوزباں پر سہ سنبھل گئے
 فکرِ سخنِ ضمیر کے قاتل کا حق نہیں
 بھڑکی جو آگ ذہن میں القاطِ جل گئے
 یہ انقلاب میری زمیں پر ہوا تو ہے
 لوہے کے جسمِ موم کے سانچوں میں ڈھل گئے
 معصوم آرزوؤں کی قاتل ہے مفلسی
 دن غیب کا تھا اور مرے بچے نچل گئے
 اردو کے تاجروں کی دکانیں سہجی رہیں
 اربابِ فکرِ وطن تو اجالوں میں چل گئے

محفل کا رنگ دیکھ کے میں خود ہی اُٹھ گیا
 دو چار لفظ اُس نے کہے تھے جو کھل گئے
 شعرا و ادب کی دنیا میں تعلق کا دور ہے
 سکے جو بے ثبات تھے دیکھو وہ چل گئے
 سورج کی ہر کرن سے اجالے کا ربط ہے
 جب ہم چلے تو وقت کے تیور بدل گئے
 اپنی حیات دن کے اجالے میں رات ہے
 ہم مسکرا رہے تھے یہ آنسو نکل گئے
 صادق ہمارے دور کی تاریخ میں لکھو
 ہم اُن کی ہرلم ناز میں لے کر غزل گئے





دوستوں سے بھی محبت کا رشتہ کتنا
 اپنے ہی شہر میں رہتا ہوں میں تنہا کتنا
 میری چوکھٹ پہ مرے پاس ہی سچا سدا
 موت کو بھی ہے تقاضے کا سلیقہ کتنا
 اپنے کمرے ہی میں رکھی ہے تمہاری تصویر
 اجنبی پھر بھی مجھے لگتا ہے چہرہ کتنا
 موم کے دل ہیں یہ فولاد صفت سینوں میں
 ہم کو دیکھو کہ ہے جینے کا سلیقہ کتنا
 اپنے بچوں کو کھلونے بھی نہیں دے سکتے
 حسرت دیاں سے محکم ہے یہ رشتہ کتنا

تم نے دو لفظ کہے تھے تمہیں حساس نہ تھا
 شیشہ دل انہی لفظوں سے ہے ٹوٹا کتنا
 جب بھی اخبار کو پڑھتا ہوں آتا ہے خیال
 میری دنیا میں ہے تاریک سویرا کتنا
 بند پانی جو کیا جاتا ہے مجھ کو صادق
 یاد آتا ہے وہ معصوم سا بچہ کتنا



کتنے منظر مری آنکھوں میں سمٹ آتے ہیں
 عکس بنتے ہیں بگڑتے ہیں بکھر جاتے ہیں
 دن گذرتا ہے تری راہ پہ پتھر کی طرح
 رات آتی ہے تو غم اور کھی بڑھ جاتے ہیں



جب کبھی اس کے خدو خال بتایا کیجے
 کتنی آنکھوں میں وہ رہتا، یہ دیکھا کیجے
 ہاتھ اپنے کبھی ہیں پتھر کبھی اٹھا سکتے ہیں
 پر ہمیں پاس مروت ہے اسے کیا کیجے
 شوق سجد کا اگر ہے تو خلوصِ دل سے
 اُس کی چوکھٹ پہ فقط ایک ہی سجد کیجے
 ایک لمحے کا تبسم ہے تمنائے حیات
 آپ کو شک ہو تو گلشن کا نظارہ کیجے
 پیاس ظاہر ہو تو توہینِ وفا ہوتی ہے
 راہ میں آئے جو دریا تو کنارا کیجے
 میں تو صادق ہوں مجھے یاد ہے اپنا منصب
 ”اپنے بارے میں ذرا آپ بھی سوچا کیجے“



یہ کتابِ ہستی پر جانے کس نے لکھا ہے
 موت زندگانی کا آخری کنارہ ہے
 جیسے پھول کی پتی تم نے خط میں بھیجی ہے
 ترے میرے کمرے میں خوشبوؤں کا چرچا ہے
 میں تو سنگِ یزوں کو آفتابِ کرلوں گا
 تم کو سوچنا ہو گا کس کے گھر اُجالا ہے
 جسم بکتے دیکھے ہیں ہم نے چند سیو میں
 یاں ضمیر بکتے ہیں یہ عجیب دنیا ہے
 جن پہ تم نے انگلی سے میرا نام لکھا تھا
 میں نے ان کتابوں کو اپنے ساتھ رکھا ہے

روشنی کے سوداگر دھوپ کے ترستے ہیں
 ان سلگتی آنکھوں نے یہ کبھی حال دیکھا ہے
 میسکدے کا دروازہ ماں کی گود ہوتا ہے
 درد میں سیما ہے غم میں اک سہارا ہے
 اُس کو کہتے ہیں صادق جو فضائے ہستی میں
 دار کی بندی سے حق کی بات کہتا ہے



قطع

جس نے توڑا تھا مراد روہ مرا بھائی تھا
 جس نے لوٹا تھا مرا گھر وہ مرا بھائی تھا
 میرے ہرزخم سے صادق یہ صدا آتی ہے
 جس کے ہاتھوں میں تھا خنجر وہ مرا بھائی تھا



گھلے گلاب کے چہرے پہ دکشی لے کر
 وہ میرے ساتھ ہیں پھولوں کی تازگی لے کر
 شراب نہ ہر سہی آسرا تو بنتی ہے
 حیات کاٹ رہا ہوں میں بیخودی لے کر
 وفورِ شرم سے دریا کی آنکھ بھر آئی
 پلٹ گیا تھا وہ دریا سے تشنگی لے کر
 بدل رہا ہوں میں بازار کے اصولوں کو
 اُجالے بانٹ رہا ہوں میں تیرگی لے کر
 تضادِ سن بنا جب وہ پاس آئے ہیں
 غرور آنکھوں میں چہرے پہ سادگی لے کر

حسین "تاج" یہ جیسے سحر کا آنچل ہو
 میں ایسے آیا ہوں محفل میں شاعری لے کر
 زباں کا زخم ہے ہر حال میں ہر اہوگا
 تمہارا طنز رہے گا مری خوشی لے کر
 ہمارے چہرے صحیفے ہیں زندگانی کے
 انہیں پڑھو تو سہی دل کی روشنی لے کر
 بس اک نظر ترے چہرے کو دیکھ لے صادق
 وہ ایک لمحہ عطا کر یہ زندگی لے کر





زمیں کب تک رہے گی تنگ دشمن آسماں کتب
 مری سینے سے اٹھے گا الہی یہ دھواں کتب
 چلو ساغر کی تہہ میں دفن کر دیں رنج و غم اپنے
 مسرت کا ہر اک لمحہ نصیب دشمنان کتب
 عبارت ہے غموں سے زندگانی مان لیتا ہوں
 مگر مالک مری بستی سے اٹھے گا دھواں کتب
 گذرنا وقت ہے ٹھہرا ہوا ہے کارواں اپنا
 بتاؤ ہم صفیرو یہ ثبات کارواں کتب
 یہ مٹی کے بدن شیشے کے الوانوں میں رہتے ہیں
 ہمارے ہاتھ میں پتھر ہیں گے رائیگاں کتب

چلو اب جراتِ اہل جینوں کی بات سمجھائیں
 جہانِ آب و گل میں نالہ و آہ و فغاں کتک
 ہزاروں سال گزرے آنکھ کے آنسو نہیں سوکھے
 مرے مالک کون و صبر کا یہ امتحاں کتک
 مجھے صادق یہی تو پوچھنا ہے اپنے حاکم سے
 کہ دھرتے رہو گے ظلم کی یہ داستاں کتک



دو شعر

رنگیں ہے کائنات غزل کہہ رہا ہوں میں
 آنکھوں میں ہے حیات غزل کہہ رہا ہوں میں
 جس کی حسین ذات نے شاعر بنا دیا
 اُس کا ہے التفات غزل کہہ رہا ہوں میں



نظریں اٹھیں تو دید کے جذبے سنور گئے
 آنسو نہ جانے کیوں مری آنکھوں میں بھر گئے
 مٹی میں تل رہی ہے جو اصر کی آبرو
 کیا جانے کس زمین پہ اہل نظر گئے
 پتھر تراشتے ہیں وہ ہیروں کے شہر میں
 کارِ یگر ان شہر کے جذبے بکھر گئے
 اب اپنے شہر میں بھی درندوں کا راج ہے
 کیا انقلاب ہو گیا ان ادا کدھر گئے
 ان کی کہانی رہ گئی تکیں کے واسطے
 تہذیبِ فکر و فن کے محافظ گذر گئے

بس کچھ کتابیں شلف پہ رکھی ہوئی ملیں
 دفتر سے لوٹ کر جو کبھی اپنے گھر گئے
 جو سایہ دار پیڑ تھے بستی کے واسطے
 وہ لوگ خشک پتوں کی صورت بھر گئے
 صادق وہ چند لوگ جو پیاسے کے ساتھ
 تاریخ ہے گواہ بڑا کام کر گئے



دو شعر

ماضی کی سرد گود میں چلتا ہے آدمی
 دار و رس کے سائے میں پلتا ہے آدمی
 اپنی انا کی لاش لئے اپنی گود میں
 فنجس کی تیز دھار پہ چلتا ہے آدمی



پیاس پانی کا دل بڑھاتی ہے
 یوں سمندر کو موت آتی ہے
 رات روشن ہے تیری یادوں سے
 صبح ظلمت میں ڈوب جاتی ہے
 ایک لمحے کی زندگی کے لئے
 کتنی صدیوں کو موت آتی ہے
 روز خوابوں کی فصل بوتا ہوں
 روز برسات روٹھ جاتی ہے
 ساری مستی شراب خانے کی
 تیری آنکھوں میں ڈوب جاتی ہے

مسکراتا ہوں غم کی بانہوں میں
 ساری دنیا فریب کھاتی ہے
 ایک بچے نے مجھ سے پوچھا تھا
 کیا اجالوں کو موت آتی ہے
 لوگ صادق کو یاد کرتے ہیں
 جب صداقت کی بات آتی ہے



دو شعر

خاموش وقت ات کا چہرہ دھوا دھواں
 ڈھلتے ہوئے شباب کی بے ربط داستاں
 بہتی ہوئی شراب کا ٹوٹا ہوا غرور
 ساقی کی چشم ناز میں بوتل کی ہچکیاں



یہ وقت آگ کا دریا ہے آسرا دینا
 اگر میں چل بھی اٹھوں پھونک کر بچھا دینا
 یہی ہے شرطِ وفا پتھروں کی لستی میں
 لہو ہے بھی جو زخموں سے مسکرا دینا
 یہ خنجروں کی سلگتی ہوئی زبانیں ہیں
 انہیں نہ پھول کی پتی کا تم پتہ دینا
 یہ میرے شہر کی ٹوٹی ہوئی فصیلیں ہیں
 انہیں گرا کے نیا شہر اک بسا دینا
 تمہارے گھر کا ہر اک فرد روٹھ جائیگا
 ذرا سنبھل کے مرے حق میں فیصلہ دینا

یہ ایک آگ کے دریا کا جلتا ساحل ہے
 یہاں نہ موم کے جسموں کو آسرا دینا
 میں خود ہی گھرے سمندر سے لوٹ آؤں گا
 بس ایک بار مجھے پیار سے صدا دینا
 ہمارے دور کے بچے کبھی پوچھ لیتے ہیں
 وفا کا پیار کا اخلاص کا پتہ دینا
 یہ میرے گھر کی روایت کا پاس ہے صادق
 زبانِ زخم سے قاتل کو بھی دعا دینا





نظروں میں انقلاب کے تیور سما گئے
 القاط خود سمٹ کے مرے پاس آ گئے
 مفلس کی بیٹی گورِ غریباں کا اک چراغ
 وہ کون تھے جو چپکے سے اس کو بچھا گئے
 یہ درد میرے دل کی زمیں کا شجر تو ہے
 وہ انقلابِ وقت کی نظروں میں آ گئے
 وہ لوگ جن کے قدموں میں رقصاں بہا رہی تھی
 سو کچھ ببول میری زمیں پر اٹکا گئے
 میں ریزہ ریزہ ٹوٹ کے بجھ رہیوں چار سو
 وہ جب قدم قدم مری محفل میں آ گئے

جب بھی غزل کہی ہے تو محسوس یوں ہوا
 وہ میرا پس آگئے دل میں سما گئے
 صادق و فا کے نام سے جلتے ہیں وہ چراغ
 تاریکیوں کے شہر کو جو جگمگا گئے



دو شعر

لگا ہوں سے برسے ہیں آنسو کی صورت
 مرے چاکِ داماں پہ پانی کے شعلے
 یہ پتھر کے بازو یہ فولاد کے دل
 سلگتی ہوئی اک کہانی کے شعلے



اس دور میں سکین کا ساماں نہیں ہے
 جیتے ہیں مگر جینے کی پہچان نہیں ہے
 ٹوٹے گا بہر حال اگر چوٹ لگے گی
 مٹی کا کھلونا ہے یہ انسان نہیں ہے
 جسموں پہ تقدس کے لبادوں کو نہ دیکھو
 عالم وہ نہیں ہیں جنہیں ایمان نہیں ہے
 ہم لوگ کھلے ذہن کھلے دل سے ملیں گے
 آجائے دروازے پہ دربان نہیں ہے
 معصوم تبسم نے یہ پوچھا تھا کسی دن
 اس جھڑپ میں کیا کوئی بھی انسان نہیں ہے
 انگلی سے جو ریتی پہ لکھا ہے وہی پڑھ لو
 صادق ہے غریب آدمی دیوان نہیں ہے





گلاتہذیب کا کاٹا گیا ہے
 یہ میرے شہر کا اک واقعہ ہے
 ستارا ٹوٹ کر جب بھی گرا ہے
 بچھڑنے کا سماں یاد آ گیا ہے
 میں اس چھوٹے سے بچے کی طرح ہوں
 جو ہر تستی کے پیچھے بھاگتا ہے
 مجھے اک بار پھر آواز دینا
 یہ آوازوں کا جنگل گونجتا ہے
 میں لاشوں کے سمندر میں کھڑا ہوں
 زباں پر زندگی کا مرثیہ ہے

محبت ایک لفظِ معتبر ہے
 مری کاپی میں ایسا ہی لکھا ہے
 وہ اک فنکار ہے نظروں کے آگے
 جو صادق کی زباں میں بولتا ہے

○ تین شعر

اُف وہ جتیاں سا چہرہ وہ چلن آوارہ
 آنکھ شرمائی سی ماتھے پہ شکن آوارہ
 اُن کے قدموں کے نشاں کچھ کے چلتی ہے بہا
 ایسا لگتا ہے کہ ہو جیسے چمن آوار



بہو کے دیپ روشن ہیں چمن میں
 اُجلا ہے ہماری انجمن میں
 خیالوں کا کفن بنتا ہے مصرع
 بہو شامل نہ ہو گر فکر و فن میں
 تھی عادت درد و غم میں سُکرا نا
 روایت ہے یہ اب اہل دکن میں
 یہ مصرع ایک افسانہ ہے شاید
 ”بہارِ بے خزاں آئی چمن میں“
 نئے سورج تراشو فکر و فن کے
 اندھیرا ہے بہت صحنِ چمن میں

ہر اک چہرے پر یہ کس نے لکھا ہے
 مسافر ہوں میں اپنے ہی وطن میں
 یہی صادق ہماری داستاں ہے
 ہمیشہ ہی رہے دار و رسن میں



تین شعر

جو انقلاب چھپا گئے ہیں سینوں میں
 کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں ان زمینوں میں
 تمہارا روپ، تمہاری نظر، تمہارا ریدنا
 تلاش کرتا ہوں مدت سے وہ جبینوں میں
 تمہیں خبر نہیں صادق مگر یہ بات تو
 تمہارے نام کا جرجا ہے غم نصیبوں میں



محسوس یہ ہوتا ہے فلک بوس زمیں ہے
 یوں آپ کی چوکھٹ پہ جھکی میری جبین ہے
 یہ ٹوٹ کے بہتے ہوئے لمحات کا دریا
 میری ہی نگاہوں میں رُکے گا یہ یقیں ہے
 پھولوں کو جو جلتے ہوئے صحرا میں اُگائے
 ایسا بھی کوئی شخص زمانے میں کہیں ہے
 وہ ایک ہی چہرہ ہے جسے دیکھ کے اکشر
 محسوس یہ ہوتا ہے یہ دنیا بھی مَیں ہے
 اے عظمتِ فردوسِ تصورِ قری نسبت
 ہر دور کی تقدیر ہے ہر دل کا یقیں ہے

ہر دل کے صحیفے پہ لکھا ہے یہی مصرعہ
 ”فردوسِ ادب“ محفلِ اربابِ لقیں ہے
 صادقِ غم و آلام کے طوفاں میں رہا ہے
 ہر دور کی تاریخ ہے یہ چھوٹا تہیں ہے



تین شعر

کون آتا ہے یہ چلتی سی چٹاؤں کے قریب
 وقت کی دھوپ میں تپتی ہوئی یادوں کے قریب
 کس نے پتھر کی جبینوں میں اگلے سورج
 کون آیا تھا یہ ویران چٹانوں کے قریب
 جامِ ٹوٹے ہیں کسی دوست کے وعدے کی طرح
 سازِ خاموش ہیں بے آس اجالوں کے قریب



شہر شہر و فاپر کوئی دستور نہیں
 جس کو دعویٰ ہے قیادت کا وہ منصور نہیں
 دیکھ سکتا ہوں اُسے اپنے ارادوں کے قریب
 میری منزل مرے قدموں بہت دور نہیں
 پیارا احساں و فادر دوالم ان کی عطا
 ترک کردوں یہ امانت مجھے منظور نہیں
 فکیر آزاد ارادے ہیں جواں عزم بلند
 قید خانہ میں سہی پھر کبھی میں مجبور نہیں
 ظلمتیں میرا مقدر ہے ہر اک وز ہے شب
 سلسلہ شب کا ہے لیکن شبِ دیوور نہیں

جب بھی چاہوں گا بدل دوں نظامِ ہستی
 آپ مختار سہی میں بھی تو مجبور نہیں
 میرا فسانہ کا عنوان مری حسرت کا نشان
 خون کی سُرخ چہ اس مانگ میں سینہ دہریں
 آپ صادق کو بہر حال دہاں بلو الیں
 ظلمتیں ہوں جہاں محفل میں کوئی نور نہیں



ایک شعر

حیات یوں تھے قدموں پہ رقص کرتی ہے
 کہ جیسے پھول کی پتی پہ قطرہ شبنم



ایک سے چہرے ایک سے احوال
 ایک ہی ہے ہر اک نظر میں سوال
 اس فسادوں کی جلتی بستی میں
 کتنا جھوٹا ہے زندگی کا خیال
 اے خلوص و فاس ہمارا دے
 اُن سے کہتا ہے درد کا احوال
 چار تنکوں کو آشیاں کہہ کر
 میں نے دیکھا ہے بجلیوں کا جلال
 دھلتا سورج ہے روشنی کم ہے
 اس کو کہتے ہیں رختوں کا زوال

زندگی کی طویل راہوں پر
 تم کہیں ہو کہیں تمہارا خیال
 بھر کی رات یوں گزاری ہے
 ایک اک لمحہ ہو گیا اک سال
 آپ صادق کو کیا سمجھتے ہیں
 چڑھتے سورج کی ہے وہ ایک مثال



دو شعر

زندگانی کو نیا روپ دیا ہے میں نے
 اپنے زخموں کو بھی کانٹوں سے سیا ہے میں نے
 تم کو چاہا ہے بہت ٹوٹ کے چاہا ہے تمہیں
 ہاں محبت کا جس جرم کیا ہے میں نے



تصویرِ اُت کی دنیا میں روشنی ہوتی
 تمہارا ساتھ جو ملتا تو زندگی ہوتی
 ہزار بادہ و ساغر ہیں سامنے لیکن
 تمہاری آنکھ سے پتیا تو میکشی ہوتی
 خیال لفظ کے سانچے میں ڈھل گیا ہوتا
 تمہارا نام جو لکھتا تو شاعری ہوتی
 گلوں سے خار کا رشتہ سمجھ میں آجاتا
 ترے غرور میں شامل جو سادگی ہوتی
 یہ چند لفظ ہیں صاف کی شاعری تو نہیں
 سنبھل گئے سوچ کے لکھتا تو شاعری ہوتی



بے نام سی ہے ایک تمنا بنی ہوئی
 میری حیات کبھی ہے تماشا بنی ہوئی
 میں خود ہی ٹوٹ ٹوٹ کے بکھرا ہوا بار بار
 کبھر بھی ہے میری ذات معمہ بنی ہوئی
 آواز دے ہا تھا کوئی راہ شوق سے
 پلٹی مری حیات تمنا بنی ہوئی
 نظروں میں اپنے کوئی بھی چہرہ نہیں رہا
 آتی ہے تیری یاد ہی چہرہ بنی ہوئی
 صادق کی شاعری بھی ہے خاموش احتجاج
 لفظوں کے سپرین میں تقاضہ بنی ہوئی



چمن برباد ہوگا پر سلامت آشیاں ہوگا
 میں کہتا ہوں نہیں ہوگا وہ کہتے ہیں کہ ہاں ہوگا
 زمیں زرخیز ہے ”فردوس“ والوں کا عطیہ ہے
 مجھے اس کا یقین ہے محو حیرت آسماں ہوگا
 لہو کا داغ آئے گا جبین شوق پر جس دن
 وہ تہذیب و تمدن کی تباہی کا نشان ہوگا
 کبھی الفاظ بھی خنجر کی صورت زخم دیتے ہیں
 جو گھائل ہوگا لفظوں سے وہ مقتولِ زباں ہوگا
 مری آنکھوں میں دم ہوگا صدمہ نکالے گی مشکل سے
 چلے آؤ چلے آؤ یہی دردِ زباں ہوگا

مجھے محسوس ہوتا ہے وہ میرا پاس بیٹھے ہیں
 مگر اس کا یقین ہے وہم ہوگا یا گمساں ہوگا
 میں اُس لمحے کو اپنی زلیلت کا عنوان بنالوں گا
 نہ کوئی فاصلہ جب میرے تیرے درمیاں ہوگا
 چمن میرا ہے میں نے پیار سے اس کو سنوارا ہے
 اگر میری روش بدلے گی پھولوں کو گراں ہوگا
 ہمارے شہر میں لاشوں کا تاجر جب بھی آئے گا
 ٹھہرا ہوں یہ برسے گا فضاؤں میں دُھواں ہوگا
 چلو تم جرم کرنا ہم سزا اُس کی بھگت لیں گے
 مگر اک روز آئے گا کہ عادل درمیاں ہوگا
 ابھی تو ذہن و دل کی کشمکش ہے راہِ ہستی پر
 یہ عالم بیت جائے گا جو صادق پاسبان ہوگا



راستے پر نقشِ پا ہیں کارواں ملتا نہیں
 رہبرانِ وقت میں اک ہمراہ ملتا نہیں
 یاد اٹتا ہے کہ روشن ہو گیا تھا گلستاں
 ڈھونڈتا ہوں اب تو میرا آشاں ملتا نہیں
 میری بستی میں محبت کا عجب دستور ہے
 دوست مل جاتے ہیں لیکن ازل ملتا نہیں
 میری آنکھوں میں رہو یا میرے دل میں گھر کرو
 کون کہتا ہے سلیقہ کا مکاں ملتا نہیں
 آبلہ پا، دھوپ، صحرا، تشنگی کے باوجود
 ڈھونڈتا پھرتا ہے لیکن کارواں ملتا نہیں

وائے برقعِ خطِ زبانِ عِلم و دانش، فکر و فن
 معتبر کوئی بھی دانشور یہاں ملتا نہیں
 اے زمانہ سازِ ہستی کُن کی پھر آواز دے
 جس کو تو انسان کہتا، یہاں ملتا نہیں
 محفلِ صورتِ نگرانِ عشق میں ڈھونڈو اُسے
 کون کہتا ہے کہ صادق کا نشان ملتا نہیں



ایک شعر

چند پیسوں کیلئے جن کے قلم بکتے ہیں
 تم کو مل جائیں گے ہوٹل میں وہ فنکار بہت



رات آئی تری یادوں کا سمندر آیا
 بند دروازہ سے ہوتا کوئی اندر آیا
 یوں بھی ہوتا، کڑی دھوپ میں چلتے چلتے
 کوئی آواز لگاتا ہے قلندر آیا
 دل کے دروازہ پہ صدف بستہ کھڑے تھے جذبات
 فاتح مملکتِ عشق سکندر آیا
 اے سمندر کے خدا آج تو شہنشاہ دیے
 جلتے صحرا کی تیش کھا کے قلندر آیا
 وقت صادق ہے اُسے دک کے پوچھو تو ذرا
 کیسے اس شہر میں پیاسوں کا سمندر آیا



پتھر سے کمر ہا ہوں جواک گلبدن کی بات
 دانشوری کی دین ہے دیوانہ پن کی بات
 خاموشی زندگی نے دیا ہے یہ حوصلہ
 آنکھوں سے کمر ہا ہوں تری انجمن کی بات
 محفوظ ہے روایت کہنہ بنی بھوی
 تاریخ کی کتاب میں اہل دکھن کی بات
 ہم نے فرازدار پہ کی حق کی گفتگو
 ہم سے چلی ہے دہر میں دار و رسن کی بات
 یارب ترے ہی ہاتھ ہے اب آبروئے شعر
 پتھر مزاج کرتے ہیں شعر و سخن کی بات

سو راج کو پی لیا ہے اندھیروں کو اوڑھ کے
 یوں ہو رہی ہے دوستو شعر و سخن کی بات
 اک لفظ کُن ہے جس کی ہے تفسیر میری ذات
 دھرتی پہ کر رہا ہوں میں اپنے وطن کی بات
 آنکھوں نے کی ہے دل نے سنا ہے خلوص سے
 اس احتیاط سے ہوئی گُل پیر صن کی بات
 صادق ہے جس کا نام اُسے جانتے ہیں لوگ
 اِس دور میں بھی کرتا ہے وہ فکر و فن کی بات





جانے کون کہاں تک جاؤں راہوں پر چلتا ہے
 شعلوں کی بارش میں دیکھیں کس کا دھن چلتا ہے
 اینوں کی سوخا سمجھ کر آنسو بھی پی لیتا ہوں
 ورنہ میری آنکھ کا آنسو سوج بن کر ڈھلتا ہے
 ساغر بن کر جن کی جوانی گردش کرتی رہتی ہے
 اُن سے پوچھو کمون سیہ راتوں میں کیوں کر چلتا ہے
 اُس کو ہم نے رہبر مانا اس کے پیچھے چلتے ہیں
 جو شعلوں کی بارش کرتا بستی بستی چلتا ہے
 چہروں کی من بھڑ میں شاید اُس کا کوئی دست نہیں
 رات کی بانہوں میں جو صادق غم کا مارا لپکتا ہے



اتنا کافی ہے مجھے اپنی خوشی کے واسطے
 انکی آنکھوں کا سہارا میکشی کے واسطے
 بیکسی بیچارگی، درد و الم، خوفِ گناہ
 کتنے مشکل مسئلے ہیں آدمی کے واسطے
 اپنی آنکھوں میں جلایا ہے تبسم کا چراغ
 اُن کی محفل میں ذرا سی روشنی کے واسطے
 ایک غنچے کے تبسم نے بتایا ہے مجھے
 ایک دو لمحے بہت ہیں زندگی کے واسطے
 محترم ہے زندگی صادق کسی کی یاد میں
 ورنہ کیا رکھا ہے دتیا میں کسی کے واسطے



تھر کا پجاری کبھی آفر نہیں ہوتا
 شیشہ کا جگر واقف جوہر نہیں ہوتا
 وہ پیاس کا مارا بھی یہی سوچ رہا ہے
 اے کاش کہ قدموں میں سمندر نہیں ہوتا
 وہ اشک جسے دامنِ رحمت نہیں ملتا
 گوہر کی طرح ہوتا ہے گوہر نہیں ہوتا
 آنکھوں کے دریچے سے چلے آئے دل میں
 ویران مکانوں میں کوئی در نہیں ہوتا
 صادق تو سردار بھی حق بات کہے گا
 مٹی کا بشر نور کا پیکر نہیں ہوتا



وہ پاگل ہوتا ہے میرے مری نظر کی طرح
 مگر میں دیکھ نہ پایا اسے بشر کی طرح
 مرا شرف مری نسبت سے تیرے قدموں سے
 میں محترم ہوں مگر تیرے سنگِ در کی طرح
 سوالِ آب پہ پتھر گلائے جاتے ہیں
 یہ شہر بھی ہے شہیدوں کی رگِ مری کی طرح
 یزیدِ وقت سے پانی کا کیا سوال کروں
 کھڑے ہوئے ہیں بڑی دیر سے سحر کی طرح
 اسی کے خشک لبوں پر ہے اعتبارِ حیات
 کہ جس کا نام بھی ہے حرفِ معتبر کی طرح

صدف میں رہتا ہے گہرے سمندروں کے تلے
 مرے خیال کا پسیر بھی ہے گہر کی طرح
 یہ فکر و فن کا عجب انحطاط ہے صادق
 کہ اب غیب بھی لگتا ہے اک ہنر کی طرح



دو شعر

پہرے میں زبانوں پہ قلم ٹوٹ گئے ہیں
 اس دور کا دستور ہے فنکار کی زنجیر
 حالات کے صحرا میں یہ پیاسوں کا سفر ہے
 ہیں ہاتھ بندھے پاؤں میں انکار کی زنجیر



آئینہ میں بن گیا ہوں جب مجھے ستھر ملا
 آپ کی نظروں میں آیا ہوں تو یہ جو ہر ملا
 سوکھے دریا کے کنارے سُورہا پلوریت پر
 بے درو دیوار کتنا خوبصورت گھر ملا
 جب سلیقہ آگیا لہجے پر کھنے کا مجھے
 لفظ گہرے ہو گئے ہر لفظ میں دفتر ملا
 رقص فرما موت تھی پھولوں کے نازک جسم پر
 روشنی آنکھوں میں آئی جب تو یہ منظر ملا
 یوں مکمل کی ہے اندازِ جنوں کی داستا
 پتھروں کے مول بیچا ہے اگر گو ہر ملا

پیاس دریا کا مفذّر بن گئی تھی ایک دن
 واقعہ یہ بھی مجھے تاریخ کے در پر ملا
 مسکرا کر جس نے اُٹا تھا بساطِ ظلم کو
 ایک ایسا بھی سپاہی بر سرِ محشر ملا
 میرے آنسو بھی امانت ہیں اُسی کے دوستو
 اس کے قدموں میں بچھا دوں گا اگر رہبر ملا
 بخش دوں گا اپنی ساری فکروں کی کاوشیں
 مجھ کو صادق گر جہاں میں کوئی قد آور ملا





حکایتِ غمِ دوراں اسیرِ ذاتِ ہوئی
 ہماری زلیلت کبھی صرفِ تغیراتِ ہوئی
 اُجالے بیچ کے ہم نے خرید لیں راتیں
 میں سوچا ہوں کہ کیسے یہ وارداتِ ہوئی
 وزیرِ زد پہ ہے اور بادشاہ بے بس ہے
 تمہاری جیت ہوئی ہے نہ میری مائ ہوئی
 کوئی صدا کتنی نہ آواز اور نہ سرگوشی
 مگر یہ بات ہوئی ہے کہ اُن سے با ہوئی
 وہ ایک نام جسے کوئلے سے لکھا تھا
 مٹا دیا ہے تو تارِ یک کائناتِ ہوئی

وہ میرا بھائی تھا زخموں کی دے گیا سوغات
 وہ میرا گھر تھا جہاں ایسی واردات ہوئی
 تمہارے دور میں صادق کا کام ہی کیا ہے
 وہ سچ کچھ کا اگر زندگی کی بات پوئی



دو شعر

کھلونوں کی دُکّاں پر درو کے شہکار لایا ہوں
 یہ کچھ آنسو ہیں جن کو بیچنے بازار آیا ہوں
 جسے دنیا نے بڑھ کر زندگی کا نام دے ڈالا
 اُسی بے ربط سی خواہش کا صادق میں تمایا ہوں



ستم کدہ میں ستمگر سے پانی مانگتے ہیں
 عجیب لوگ ہیں پتھر سے پانی مانگتے ہیں
 یہ میرے شہر کی تہذیب کا زوال تو ہے
 جو جل رہا ہے اُسی گھر سے پانی مانگتے ہیں
 روایتوں کی حقیقت پہ شک کرے نہ کوئی
 بس اتنی بات ہے اس ڈر سے پانی مانگتے ہیں
 ہم اپنے شہر کے حاکم سے کچھ نہیں کہتے
 تڑپ تڑپ کے ستمگر سے پانی مانگتے ہیں
 سوالِ آب پہ تیروں کا مینہ برسنا ہے
 عظیم لوگ ہیں شکر سے پانی مانگتے ہیں

ہمارا طرز تو صدیوں میں بھی نہیں بدلا
 ہم اپنے ساقی کو تر سے پانی مانگتے ہیں
 ہمارے شہر کا صادق عجیب عالم ہے
 کہ اہل طرف بھی گھر گھر سے پانی مانگتے ہیں



دو شعر

چمے کے رنگ روپے نکھر امواث باب
 ساغر میں جیسے گھول دیا جائے آفتاب
 دونوں نے بل کے ساتھ بھجائی اپنی پیاس
 میں اُس کو پی چکا ہو مجھے پی چکی ستراب



میری آنکھوں میں کسی نے تو یہ دیکھا ہوگا
 بہتے پانی میں کسی شخص کا چہرہ ہوگا
 جسکی آنکھوں میں سندر کی سی گہرائی ہو
 اُس کے ہونٹوں تبسم کا سلیقہ ہوگا
 میں نے ریتی میں لگا ہیں گلابوں کے شجر
 پھول صحرا میں کھلیں گے تو تماشا ہوگا
 یہ روایت بھی حقیقت بھی ہے تاریخ بھی ہے
 آستیں خون میں ڈوبے گی تو چرچا ہوگا
 اپنے ماحول کی زیرِ ہلی فضاؤں کے طفل
 اب تو پھولوں پہ بھی شبنم کو پرکھنا ہوگا

کتنی صدیوں سے یہی بات وہ دہراتے ہیں
 رات گزے گی تو ہر سمت اُجالا ہوگا
 ہم تو اس شخص کے سایہ میں بسر کرتے ہیں
 جس کا سایہ نہ فلک نے کبھی دیکھا ہوگا
 جن کتابوں میں لکھی ہے ترے صادق کی حیات
 اُن کتابوں پہ ترا نام بھی لکھا ہوگا



ایک شعر

تاریخ کے ہر دور نے دہرایا ہے اُن کو
 غم جو مرے نام سے منسوب ہوئے ہیں



خود کاشتہ فساد کا احوال دیکھنے
 ٹوٹے ہوئے کائنات مرا حال دیکھنے
 میں ریزہ ریزہ ہو کے فضاؤں میں بٹ گیا
 اب آ رہے ہیں وہ مرے اعمال دیکھنے
 میں خود کو چھوڑ آیا سمندر کی گود میں
 طوفان کی زندگی کے مہ و سال دیکھنے
 تصویر تیری میز پر رکھی رہی مگر
 برسوں لگے ہیں تیرے خد و خال دیکھنے
 تقسیم کر رہا ہوں میں اپنی متاعِ فکر
 نسلاً فقیر زادوں کو خوشحال دیکھنے
 مادیقِ فقیہہ شہر کو آئینہ دیکھنے
 اپنی نظر سے اپنے ہی اعمال دیکھنے





تیرے لہجے کا ترنم بھی ہے جھنکار بھی ہے
 زندگی پیار بھی ہے درد کا اظہار بھی ہے
 میں تو انجان مسافر ہوں چلا جاؤں گا
 تیری محفل سے الگ سایہ دیوار بھی ہے
 میں نے اپنے کو کتابوں میں چھپا رکھا ہے
 لفظ میرے لئے سایہ بھی ہے تلوار بھی ہے
 وہ تو اخبار کی سُرختی ہے اُسے پڑھ لینا
 سنسنی خیز سہی لائق اظہار بھی ہے
 کتنی لاشوں نے یہ پوچھا ہے کہ بستی والو
 سب ہیں محصوم یہاں کوئی گنہگار بھی ہے
 کتنا آسان ہے صادق کا تعارف سُن لو
 ایک سادہ سا مسلمان بھی فنکار بھی ہے





تاریخ میکشی کی مکمل کتاب ہے
 وہ آدمی نہیں ہے پرانی شراب ہے
 خود میں نے اپنے دل کو سمندر بنا لیا
 اب زندگی نہیں ہے فقط اضطراب ہے
 دروازہ کھٹکھٹاتا رہا کوئی رات بھر
 میں سوچتا رہا یہ حقیقت ہے خواب ہے
 کتنی کہاں سے کیسے میسر ہوئی شراب
 یہ سب ہی جانتے ہیں مرا کیا جواب ہے
 نغمے لٹا رہوں میں بھوکوں کے شہر میں
 دانشورانِ قوم بڑا انقلاب ہے

سو کھئے ہوئے بیول کے سائے میں بیٹھ کر
 یہ سوچتا ہوں کونسا کانٹا گلاب ہے
 صادق زینِ شعر پہ سبزہ اُگائیے
 وہ دیکھتے ہیں جن کی نظر آفتاب ہے



تین شعر

رُخ بدل دے بھی اگر وقت کا بہتادریا
 تم چٹانوں کی طرح راہ گزار دوں میں رہو
 گل کے دامن پہ گر و قطرہ شبنم بن کر
 مسکراتے ہوئے گلشن کی بہاروں میں رہو
 ایک ہی بار سہمی ٹوٹ کے صادق سے ملو
 اس کی محفل میں چلو درد کے ماروں سے ملو



پھر کتابِ زلیت پر میرا یہ افسانہ لکھو
 زخمِ رستے ہیں مگر خوش ہے یہ دیوانہ لکھو
 خون پیسے ہیں مگر تشنہ لبی جاتی نہیں
 رات کی بانہوں میں ہے انک یہ منجانہ لکھو
 ہم جہاں کانٹوں پہ چلتے تھے گلوں کا چاہیں
 یاد آتا ہے ابھی تک بھی وہ ویرانہ لکھو
 اے فسانہ سازِ ہستی میکدے کی آبرو
 نام کا تیرے اٹھار کھا ہے پیمانہ لکھو
 میں نے رکھ دی ہے تمہارے سانسے کل کا سنا
 تم فقیہ شہرِ جنت کا پروانہ لکھو
 دیکھنے والوں کی نظروں میں وفا سرتار ہے
 شمعِ تنک بھی جلے جلتا ہے پروانہ لکھو
 اب تو اس کے نام کا چرچا ہے سارے شہر میں
 تیرا صادق ہو گیا ہے وقفِ منجانہ لکھو



رات سہمے ہوئے لمبے میں کہانی کہنا
 دن نکل آئے تو آنکھوں کی زبانی کہنا
 اُن کی دیوار پہ لکھ دینا نہیں آسکتا
 اور شرم جو آنا تو جوانی کہنا
 آکے رُک جائے جو پلکوں پہ تو کہنا آنسو
 ٹوٹ کر بر سے جو آنکھوں سے تو پانی کہنا
 ہم تو پیشانی کی تحریر پڑھا کرتے ہیں
 ہم سے چہروں کی نہ خاموش بیانی کہنا
 اپنے زخموں کی دکان خوب بجا کر رکھنا
 پوچھ بیٹھے جو خریدار کہانی کہنا
 نقش صادق کا بنانا کسی کاغذ پر نہیں
 جھوٹ کہنا ہو اگر یوسف ثانی کہنا





اس نے پوچھا تھا محبت بھی کہیں ملتی ہے
 میں نے آہستہ کہا ہاں وہ یہیں ملتی ہے
 بٹری تصویر لئے پھرتا ہوں بستی بستی
 کوئی صورت تری صورت سے نہیں ملتی ہے
 مسکراتا ہے کوئی دار کے سائے میں کھڑا
 موت احساس کے جادہ پہ حسیں ملتی ہے
 پھول پتھر پہ کھلے خواب میں دیکھا تھا کبھی
 ڈھونڈتا پھرتا ہوں تعبیر نہیں ملتی ہے
 اب تو بونے بھی ہمالہ کا لقب پاتے ہیں
 اب قد آور کو کہاں کوئی زمیں ملتی ہے

وہ تو چہرے کو بدل لیتا ہے ماحول کے ساتھ
 اُس کے چہرے پہ صداقت ہی نہیں ملتی ہے
 شعرا ب ذہن سے کاغذ پہ کہاں آئیں گے
 لفظ ملتے ہیں نہ شاداب زمیں ملتی ہے
 تم نے دیکھا نہیں صادق کو طرحداروں میں
 ایسے رہتا ہے کہ تشبیہ نہیں ملتی ہے



ایک دو گام پہ منزل تھی مگر کیا کیجے
 ہم ہی پھرتے رہے آوارہ خیالوں کی طرح
 کتنی تنہائی ہے زخموں کے گھنے جنگل میں
 کتنا خاموش ہوں مندر کے خداؤں کی طرح



ایک شعلہ جو بجھ کر کتا ہے گلستاں کے قریب
 میرا آباد وہ گھر تھا کبھی ایواں کے قریب
 ہم تو مٹی کے مکانوں میں بسر کرتے ہیں
 مسکراتے ہوئے طوفان پہ طوفاں کے قریب
 ایک بے آس جوانی کی کہانی کتنی
 ایک مجھٹا ہوا دیکھ ہے غم جاں کے قریب
 ہم جہانگیر ہیں انصاف کریں گے اُن سے
 بات جب حق کی چھڑے گی رزنداں کے قریب
 تنم کو معلوم ہی کیا بھوک کسے کہتے ہیں
 آدمی لوٹ کے آ جاتا ہے حیواں کے قریب
 ایک ہی نور ہے صادق کا سہارا ہم
 فکر انساں سے پئے محفل نیرداں کے قریب





معصوم لغزشوں کو خطا کہہ دیا گیا
 دل کی ہر اک صدا کو دعا کہہ دیا گیا
 چہرے کے رنگ نور پہ پاکن ہی نگاہ
 بے نام سی خلش کو دعا کہہ دیا گیا
 کتنے بدن جلے ہیں اندھیروں کی گود میں
 کتنوں کی زندگی کو فنا کہہ دیا گیا
 دیوانگی شوق کا معیار دیکھئے
 ہر اک حسین بت کو خدا کہہ دیا گیا
 حق آندهیوں کی زد پہ سنایا گیا، جب
 ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدا کہہ دیا گیا



فکر و خیال و خواب کی باہنوں میں بانٹ دوں
 لفظوں کو فکر و فن کے اجالوں میں بانٹ دوں
 دہلیز پر کھڑے ہیں امیدوں کے قافلے
 جی چاہتا ہے درد کے ماروں میں بانٹ دوں
 جلتا ہوا چراغ ہوں طوفاں کی گود میں
 اس مختصر حیات کو تاروں میں بانٹ دوں
 شعلے سمیٹ لایا ہوں صحرا کی دھوپ سے
 تنج بستہ وادیوں کی فضاؤں میں بانٹ دوں
 تیرے گماہ اپنے مقدر میں ٹانگ لوں
 آنکھ کو زندگی کے اجالوں میں بانٹ دوں
 صادق تصورات کے خورشید کی ضیا
 ان شب کے شاہزادوں کی راہوں میں بانٹ دوں





پتھر کو رنگ و روپ کا پیکر دیا گیا
 دوشیزہ حیات کو خنجر دیا گیا
 محمل کے فرش پر بھی تھے کانٹے ببول کے
 بزم سرور و رقص کو جوہر دیا گیا
 پینے کی آرزو تھی بہادی گئی شراب
 لرزاں تھے ہاتھ ہاتھ میں ساغر دیا گیا
 تاریک آسماں کے تلے کٹ گئی حیات
 بستر کے نام پر مجھے پتھر دیا گیا
 کیچڑ کے پھول کو ٹکے کا لڑک آگے
 پستی کو آسماں کا مقدر دیا گیا
 اپنے لہو سے اُس نے جلایا چراغ کو
 صادق کو جب بھی رات کا منظر دیا گیا





تمہارے شہر میں جلتی ہے زندگی تنہا
 مرے خیال کی بجھری ہے روشنی تنہا
 میں میکدے سے چلا میکدے میں آ پہنچا
 مری حیات کا مقصد بے خودی تنہا
 تصور رات کے الجھے ہوئے مسائل سے
 قرارِ عشق ہے احساسِ شاعری تنہا
 میں ٹوٹ ٹوٹ کے بکھر رہا تیری دنیا میں
 خدائے وقت بگڑا رہی ہے زندگی تنہا
 یہ عکس عکس بکھرتے ہوئے بدن شاید
 مرے خیال کی خوشبو میں بے گلی تنہا
 یہ لوگ حضرتِ صادق کا نام لیتے ہیں
 جہاں بھی ملتی ہے لفظوں کی روشنی تنہا





طوفان کی سرگردو میں ہے سائلِ حیات
 اے ناخداے وقت دکھا منزلِ حیات
 کچھ اور بھی بڑھا دے جفاؤں کا سلسلہ
 آسان ہونہ جائے کہیں مشکلِ حیات
 رستے ہوئے لہو کا فسانہ ہے زندگی
 خنجر کی تیز دھار ہے ہر منزلِ حیات
 آنسو ہیں درد و غم ہے تمنا ہے میرے پاس
 کیا مانگتا ہے مانگے اے سائلِ حیات
 یہ جان کر بھی پتیارہا ہوں تمام عمر
 یہ قاتلِ حیات ہے یہ قاتلِ حیات
 صادقِ صداقتوں کے اجالے کی بات ہے
 یہ کاروانِ عشق ہے یہ محفلِ حیات





لکھتا ہوں ترا نام مرے نام سے پہلے
 آغاز سنور جاتا ہے انجام سے پہلے
 لیتا ہے کوئی جائزہ اعمال کا میرے
 یہ سوچ لیا کرتا ہوں ہر کام سے پہلے
 آنکھوں سے پلا دیتا ہے کوئی سرِ محفل
 مدہوش میں رہتا ہوں بہت جا سے پہلے
 میں بھی تو ذرا صبر کی معراج تک آؤں
 غم اور بڑھا دیجئے آرام سے پہلے
 لفظوں کے پھر تک اٹھتے ہیں جذبات کے شعلے
 یہ سوچ سمجھ لیجئے دشنام سے پہلے

تنہائی ہے احساں ہے یادوں کا سمندر
 بن باں ہے کیا پوچھ لو یہ رام سے پہلے
 منزل کو ذرا دور ذرا دور ہٹا دو
 ہر روز یہی کہتا ہوں ہر گام سے پہلے
 احسان جتاتے ہیں وہ آکر محفل
 یوں زخم دیے جاتے ہیں انعام سے پہلے
 وہ ایک ہی تھا ایک ہی ہے، ایک رہے گا
 دی ضبط کی طاقت جسے صمصام سے پہلے
 وہ ایک رخت آج بھی موجود ہے جس پر
 لکھا ہے ترانہ نام مرے نام سے پہلے
 صادق یہ صداقت کا تقاضہ ہے تو کہہ دو
 خیام سے آگے تھا میں خیام سے پہلے



اپنی غزلوں کو طرح دار بناؤں کیسے
 باٹ کانٹوں کی ہے پھولوں سے سجاؤں کیسے
 اب تو الفاظ بھی جلتے ہیں چتاؤں کی طرح
 گیت لکھوں بھی تو محفل میں سناؤں کیسے
 میرے زخموں کی صدا کون سنے گا یا رو
 کون قاتل ہے تباؤں تو تباؤں کیسے
 اپنے اسلاف کی تہذیب کا جو قاتل ہے
 اُس کو القاب سے عزت سے بلاؤں کیسے
 کتنے سمجھ رہے ہیں جو جسموں کی کڑی قید میں ہیں
 جانتا ہوں میں مگر تم کو تباؤں کیسے

کون ہے سلوٹِ شاہی کے طرہ داروں میں
 رازِ تاریخ کا دنیا کو بتاؤں کیسے
 یہ بھی بتلائیں مجھے اہلِ محبت کے نقیب
 بھوکے بچوں کو میں مٹی پہ سلاؤں کیسے
 بھوک تہذیب کے اقدار مٹا دیتی ہے
 اہلِ دانش سے حقیقت یہ چھپاؤں کیسے
 ذات کی قید میں صادق ہے تنہا کا وجود
 سوچتا ہوں اُسے سوئی پہ چڑھاؤں کیسے





تیری زمیں کا کوئی طرح دار چاہیے
 میں بیت تراشتاہوں پر ستار چاہیے
 ہاتھوں میں آ کے ٹوٹ گیا پھول کا بدن
 شکوہ زبانِ گل پہ ہے گلزار چاہیے
 مٹی کے ان گھنڈوں میں رہتے ہیں کجکلاہ
 دربارِ کاترے کوئی فنکار چاہیے
 یہ نوم کے بدن ہیں قیامت کی صوف ہیں
 اے کردگار سایہ دیوار چاہیے
 اب تو زبان خشک پہ نئے بھی پڑ گئے
 بس ایک جام اے مرے سرکار چاہیے
 ٹیڑھی زمیں پہ پھر سے بنانا ہے ایک تاج
 اخبار میں یہ دید و کہ معمار چاہیے
 صادق زباں کو روکے کس کی مجال ہے
 حق آگہی کی بات سردار چاہیے



انسان وہ کبھی صاحبِ توقیر چاہئے
 یہ خواب ہے تو خواب کی تعبیر چاہئے
 آوارہ گانِ شوق بمحکمۃ ہیں راہ پر
 پھر اعتبارِ عشق کی زنجیر چاہئے
 اکٹمہ کے بعد پھر یہ کسی نے نہیں کہا
 پیغمبرِ حیات کی تصویر چاہئے
 لفظوں کی بارگاہ میں ہے سترگوں خرد
 پھر سے ترے کلام کی تفسیر چاہئے
 یہ مرحلہ ہے دل کا نظر تو اٹھائیے
 میں جانتا ہوں آپ کو دلیگیر چاہئے

جب وہ عطا کرے جسے کہتے ہیں کردگاہ
 تدبیر چاہئے نہ تو لفت دیر چاہئے
 اے خسرو حیات تمنائے کائنات
 اب آجھی جا کہ نور کی تنویر چاہئے
 صادق نقیبہ شہر سے کہہ دیجئے ذرا
 تفسیر آپ کر چکے تحریر چاہئے



دو شعر

گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں رہے ہیں
 وابستہ حالات رہے تیر بھی ہم بھی
 طوفان کی گودی میں بھی صادق ہی رہے ہیں
 فنکار کے جذبات رہے تیر بھی ہم بھی



جن کے چہروں پہ لکھلکھ ہے کہ سنوارا جائے
 اُن کو کس نام سے بستی میں پکارا جائے
 ٹوٹتی ریت کی دیوار ہے اناں کا وجود
 دھوپ ڈھل جائے تو اس کا بھی سہارا جائے
 پھر بڑی دُور سے آتے ہیں لہو کے تاجر
 پھر ذرا اپنی دکانوں کو سجایا جائے
 ہم تو طوفان کی گودی میں سکوں پاتے ہیں
 پاس آئے یا بڑی دُور کنار ا جائے
 جس کے آتے ہی تمناؤں کا ساگر سوکھے
 اپنی بستی سے وہ حیوان خدا را جائے
 شعر سوکھے ہوئے پتوں کی طرح لگتے ہیں
 خون دے کر انہیں اے دوست نکھارا جائے
 جس گھڑی صدق و صداقت پہ کوئی آنچ آئے
 اُس گھڑی بزم میں صادق کو پکارا جائے



راہ محدود نہیں اُن کے شبستانوں تک
 ہم ہی بڑھ جاتے ہیں احساں زندانوں کے
 اعتبار آپ کی آنکھوں سے چھلک جاتا ہے
 میں پہنچ جاتا ہوں تاریخ کے افسانوں تک
 سرحدِ علم و یقین تک نہیں پہنچی دنیا
 ہیں ابھی وہم و گمماں علم کے دیوانوں تک
 شاعری فکر سے مربوط ہے ورثہ تو نہیں
 بس یہی لکھا ہے قرطاس کے دیوانوں تک
 عشق کی آگ سے ذہنوں کو جلا دیتے ہیں
 بات آتی ہے کبھی جب ترے دیوانوں تک

پڑھ کے تاریخ کو دیکھو تو سمجھ میں آئے
 یہ حقائق کی رسانی بھی تو افسانوں تک
 ”رات گزری کہ گزاری ہے مجھے یاد نہیں“
 صبح لے آئی ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں تک
 میں بھی صادق ہوں صدا کا بھرم رکھوں گا
 بات پہنچے گی اگر تیرے ثنا خوانوں تک



دو شعر

تہذیب تھی یہ شہر کی حیر ہے کس لئے
 پتھر کا در بھی پھول کی پتی سے داہوا
 یہ ٹھیک ہے کہ زر ہے زمیں اور نہ اقتدار
 لیکن میں پوچھتا ہوں شرافت کو کیا ہوا



جبے دا بھرتا ہے خم خانہ محشر میں
 شعلے سے بھڑکتے ہیں چھلکے ہوئے ساغر میں
 خاموش نگاہوں سے یوں پیار چھلکتا ہے
 تصویر کوئی ابھرے جیسے کسی پتھر میں
 آواز نہ دو آکر چوٹ پہ مرے دل کی
 کوئی بھی نہیں رہتا ویراں سے اس گھر میں
 تاریخ لکھوں کیسے اس دور سیاست کی
 راتوں کا اندھیرا ہے پر صبح کے منظر میں
 ہم لوگ تو بچھو لوں میں کانٹوں کا مقدر ہیں
 یہ درد بھی لکھ دیجئے احساس کے دفتر میں
 بیدار دماغوں کی اللہ رے مجبوری
 پانی نہیں پی سکتے رہتے ہیں سمندر میں
 صادق مرے جاوے کی پہچان تمایاں ہے
 تقریر کے لمحے میں اشعار کے پیکر میں



پھول کیسے ہمیں گے کون شادماں ہوگا
 پتھروں کی بستی میں کیسے گلستاں ہوگا
 ہر زبان میں جس کے دس کابیاں ہوگا
 وہ مجاہد اکبر خود ہی بے زباں ہوگا
 سن رہا ہوں محفل میں پھر وہ آنے والے ہیں
 پھر مری محبت کا آج امتحان ہوگا
 یہ اگر ہے آزادی قید کس کو کہتے ہیں
 جب چین سی ویراں ہو کیسے اشیاں ہوگا
 اور چار صدیوں تک بزمِ علم و حکمت میں
 میری فکر کا عنوان زیبِ دُستاں ہوگا
 آپ ہی کے قدموں میں ہے بہارِ گلشن کی
 آپ جس جگہ چاہیں گلستاں وہاں ہوگا
 جس کا نام صادق ہے اُس کو کیا بتاتے ہو
 — دار کی بندی پر اُس کا امتحان ہوگا۔



وعدہ رحمتِ عالم ہے گنہگار کے ساتھ
 میرے احساس کا رشتہ ہے مر پیار کے ساتھ
 شعرِ خورشید کے مانند ضیاء دیتے ہیں
 جذبہٴ شوق بھی شامل ہو جو اشعار کے ساتھ
 چاندنی رات میں وہ پہلی ملاقات کی یاد
 تیرے امن کا سہارا تری دیوار کے ساتھ
 آستینوں پہ ابھی خون کے دھبے کم ہیں
 قتل کیجے گا مری ذات کو افکار کے ساتھ
 اُس کی ہر بات ادا بھی ہے اداکاری بھی
 کب تلک اپنی نیچے گی بھلا فنکار کے ساتھ

رات چلے سے تصور میں جو آتا ہے کوئی
 چونک اٹھتا ہوں میں پازیب کی جھنکار کے ساتھ
 دارپہ نیم حفاکار میں زندانوں میں
 نام میرا بھی چلا آتا ہے ادوار کے ساتھ
 یہ حقیقت بھی تاریخ بھی تہذیب بھی ہے
 رشتہ صادق کا پرانا ہے بہت دار کے ساتھ



دو شعر

میری عبادتوں کو سلیقہ عطا ہوا
 نظروں سے ایک پھر ترا سجدہ ادا ہوا
 طاقت نہیں کلام کی کیسے دعا کروں
 جو کچھ بھی تجھ سے پایا تھا صرف دعا ہوا



سب فرشتے ہیں گنہگار بشر کوئی نہیں
 سب کو دعویٰ ہے مگر اہل نظر کوئی نہیں
 صرف الفاظ ہی بازار میں بیک جاتے ہیں
 فکر کا فن کا طلبگار مگر کوئی نہیں
 سادگی تیرا کرم ہے کہ تری محفل میں
 مطمئن سب ہیں مگر صاحب زر کوئی نہیں
 مجھ کو بہتے ہوئے دریا کی کہانی نہ سمجھ
 کشتی غمِ رواں لوحِ نظر کوئی نہیں
 شام کی زد پہ ہیں محصور اجالوں کے سفیر
 شب کے دربار میں اے دوست سحر کوئی نہیں
 بستی اپنی ہے نگر اپنا ہے اجاب اپنے
 پیر بھی فٹ پاتھ پہ بیٹھے ہیں کہ گھر کوئی نہیں
 نام صادق کا وہ لیتے ہوئے گھبراتے ہیں
 جن کی دنیا میں صداقت کا نگر کوئی نہیں

تاریخ حیدر آباد

پیارے اخلاص، وفا، عزم، تمنا حیات
حیدر آباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

اسکی بنیاد ہی الفت کا چلن ٹھہری تھی
اس کے ذروں کو سکھایا گیا آئین وفا
اسکی بانہوں میں بنے علم و عمل کے سانچے
اسکی گلیوں میں سنایا گیا آئین وفا
دل پہ شاہوں نے محبت سے حکومت کی تھی
حیدر آباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

یہ عمارات، یہ سڑکیں، یہ حسین یاغیچے
یہ مساجد، یہ منار، یہ بزرگوں کے مزار
اینٹ مٹی سے بنائے یہ تقدس کے مکاں
پیارے عشق کے معا بد یہ تمدن کے وقا

ان کی دہلیز پہ شاہوں نے وفاماںگی تھی
حیدر آباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

کوئی مانے کہ نہ مانے یہ حقیقت ہے یہی
تخت کے تاج کے وارث نے قسم کھائی تھی
رودِ موسیٰ کو محبت کا نگرہ کردوں گا
اپنی دھرتی پہ اُسی دن تو بہا ر آئی تھی

زندگانی کے لبوں پر بھی نہ سی آئی تھی
حیدر آباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

پھر ہوا یوں کہ زمین رشکِ جناب کہلائی
چارمینار بنا اپنی بلند ی کا نشان
چار سُو چار کمانوں نے ستوار اُسی کو
جن کی گودی میں پلا اور بڑھا عزمِ جواں

حُسن کو عشق نے جینے کی ادا بخشی تھی
حیدر آباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

اے قطب شاہ تری ہستی تیری فطرت کو سلام
 حیدر آباد کے بانی تری عظمت کو سلام
 تیری انسان سے بے لوث محبت کو سلام
 عشق صادق تھا ترا تیری صداقت کو سلام

چار صدیوں سے محبت کی پذیرائی ہے
 حیدر آباد کی تاریخ فقط اتنی ہے

آج بھی وقت ہے آؤ یہ ارادہ کر لیں
 اپنی دھرتی پہ نہ لاشتوں کی تجارت ہوگی
 خون مظلوم کا ہوگا نہ شقاوت ہوگی
 گھر جلیں گے نہ مذاہب کی تجارت ہوگی
 اپنی تاریخ محبت سچی محبت ہوگی



رات خواب دیکھا تھا

رات خواب دیکھا تھا

آگ کے سمت دریں تیرتی ہوئی کشتی

اک مسافر تنہا

زندگی کی چٹاپی میں

آگ کے لپیٹوں کو

پھونک کر بھجاتا تھا

رات خواب دیکھا تھا

ریگ گرم صحرا پر

کوئی ہل چلاتا تھا

اپنے خواب لیتا تھا

کاٹنے کو تعبیریں

رات خواب دیکھا تھا

ایک جسم پر جانے
 کتنے چہرے چسپاں تھے
 ایک جھوٹ کا چہرہ
 ایک چہرے قاتل

رات خواب دیکھا تھا

علم کے جزیرے میں
 جہل کے گہر وندے تھے
 ان میں بسنے والے ہی

عالموں کے اُن داتا صاحبانِ عظمت تھے
 رات خواب دیکھا تھا



خزاں رسیدہ کلی

وہ اک معصوم لڑکی
 قلم ہاتھوں میں آنکھوں میں جیا تھی
 توجہ سے مرے اشعار سن کر
 انہیں کاپی میں لکھتی جا رہی تھی
 غزل پڑھتے ہوئے میں سوچتا تھا
 کہ جانے اس کے دل میں کونسا غم ہے
 غمِ جاناں غمِ دوراں غمِ یربادیِ انساں
 اُسے اس کھنسی میں کیا ہوا ہوگا
 مگر میں جس جہاں میں نس لیتا ہوں
 وہاں ایسا بھی ہوتا ہے
 کلی کھلتے سے پہلے ہی خزاں کی نذر ہوتی ہے



دریچے ذہن کے کھولو

دریچے ذہن کے کھولو

ذرا سوچو

کہ وہ بھی آدمی ہے

جس کے لاشے پر کھڑے ہو کر

تم اپنے قدر کو ادبنا کر رہے ہو



دریچے ذہن کے کھولو

ذرا سوچو

کہ وہ بھی آدمی ہے

جس کے زخموں کا لہو لے کر

تم اپنے ہاتھ رنگیں کر رہے ہو



دریچے ذہن کے کھولو

ذرا سوچو

کہ وہ بھی آدمی ہے
جس کے مٹی کے گھروندے کو جلا کر
تم اپنی راہ روشن کر رہے ہو



دیرکے ذہن کے کھولو

ذرا سوچو

کہ وہ بھی آدمی ہے
کلب میں جس کی بیٹی ناچتی ہے
کہ بوڑھے باپ کو روٹی کھلائے



دیرکے ذہن کے کھولو

ذرا سوچو

کہ وہ بھی آدمی ہے
جو اپنا پیٹ بھرنے کو تمہیں کھگوان کہتا ہے
غریبی ایک لعنت ہے



بے نام وجود

اُسے کس نام سے آواز دوں

جو میرے جسم کے اندر

کہیں پر چھپ گیا ہے

کبھی تنہائی میں چپکے سے آکر

جو میری بند آنکھوں کے دیرپوں سے مجھے آواز دیتا ہے

مرے ہاتھوں میں ٹوٹا اک قلم دے کر

مجھے شاعر بناتا ہے



تضاد

میں ذروں میں بجھرتا جا رہا ہوں
 اندھیرے کی فصلیوں پر کھڑا ہوں
 مری آنکھوں میں بینائی نہیں ہے
 زباں رکھتا ہوں گویائی نہیں ہے
 میں صدیوں سے بس اتنا جانتا ہوں
 میں زندہ ہوں مگر زندہ نہیں ہوں



میں اور پرندہ

پرندہ مجھ سے بہتر ہے

کم از کم اُس کی اپنی اک زباں ہے

اُسے اپنی زباں میں بولنے گانے کی آزادی تو حاصل ہے

مگر سیری زباں پر

حکومت کا، سیاسی مصلحت کا

سماج اور اس کے اقداروں کا اک پہرہ لگا ہے

میں جب بھی بولتا ہوں گیت گاتا ہوں

تو یوں محسوس ہوتا ہے

کہ میری گفتگو، ہر ایک نغمہ

مرا اپنا نہیں وحشت زدہ ہے

تسلسل

کبھی اظہار کو الفاظ کی حاجت نہیں ہوتی

زباں خاموش رہتی ہے

کوئی آہٹ کوئی آواز گھاناؤں میں نہیں آتی

مگر اظہار ہوتا ہے

کبھی نیچی نظر سے

کبھی چہرے کی رنگت سے

کبھی ہاتھوں کی جنبش سے

کبھی پشیمانی کے بل سے



یہی اظہار کا واحد طریقہ ہے

جو ملکوں کی سرحد، لہجوں کے بین فرق

اور بھری زبانوں کے کوئی جھگڑے سے آلودہ نہیں ہوتا

بیوہ تہذیب

مرا یہ شہر کتنا پُر سکون تھا
 یہاں کی ہر گلی اک مدرسہ تھی
 جہاں تہذیب فکر و فن کے دھامے
 سکونِ قلب فکرِ معتبر تقسیم کرتے تھے
 مگر اک روز جانے کس گلی سے
 لہو کا ایک سوداگر نکل آیا
 لہو بکنے لگا، بہنے لگا
 مری تہذیب بیوہ کی طرح اب
 گلی کی موڑ پر تنہا کھڑی ہے



خوابِ صادق

یہ شیشے کے مکانوں میں

پگھلتے موم کے پتلے

نہ جانے کیوں سحر کی آرزو میں اتنے حیراں ہیں

سحرِ بوجی تو سورج کی تمازت سے

یہ ان کے کھوکھلے پگھلے ہوئے پیکر

• فنا ہو جائیں گے اپنی بقا کی آرزو لے کر

پھر اس دھرتی سے اٹھیں گے

وہ انساں جن کے پیکر پتھروں سے سخت تر ہوں گے

جو سورج کی تپش کو اپنے اندر جذب کر لیں گے



آوازوں کا صحرا

میں آوازوں کے صحرا میں

خموٹی ڈھونڈتا ہوں

مگر محسوس یوں ہوتا ہے جیسے

یہاں کا ذرہ ذرہ چنچمتا ہے

یہ بے ہنگام آوازیں

سماعت کو مری مجروح کرتی جا رہی ہیں

مجھے اس کا یقین ہے

کہ وہ دن آ رہا ہے

کہ میں اپنی سماعت سے ہمیشہ کے لئے محروم

اسی صحرا میں آوارہ پھروں گا

حقیقت

کوئی جب بھی تعریف کرتا ہے میری

یہی سوچتا ہوں

مرے پاس کچھ بھی تو اپنا نہیں ہے

یہ دل ہے تو ہے یہ کسی کی امانت

یہ آنکھیں کسی کی عطا ہیں

یہ فکر و بصیرت کی دو یہ ذہنِ رسا

یہ میری وفا کا صلہ ہیں

مرے پاس میرا تو کچھ بھی نہیں ہے



آئینہ سچ بولتا ہے

آئینہ سچ بولتا ہے

اسے توڑ ڈالو تو ہوگا بھی کیا

وہ دھبے تمہارے جو چہرہ کا حصّہ بنے ہیں

وہ کیسے مٹیں گے

قصور اس میں اپنا تمہارا ہے ہمدم

تو پھر آئینہ کو اگر توڑ بھی دو

زمانے کی نظروں کو کیسے جدا کر سکو گے



نسبت کا شرف

مجھے نقوی کہتا ہے زمانہ

میں نسبت سے پکارا جا رہا ہوں

مری نسبت مری پہچان کبھی ہے

آن کبھی ہے

میں نسبت کے سہارے بڑھ رہا ہوں

مری نسبت مرا ایتقان کبھی ہے

شان کبھی ہے

میں نسبت کے سہارے جی رہا ہوں

مری نسبت مرا ایمان کبھی ہے

جان کبھی ہے

قطرہ تاریخ

ڈاکٹر صادق نے بھی اربابِ دنیا کیلئے
کتنے علم و فن کی راہوں میں جلائے ہیں دیئے
میں نے سالِ طبعِ حامی عیسوی میں کچھ دیا
آگے چھپ کر بفضلِ رب یہ روشن زاویئے

۱۹۹۰ء

ابراہیم حامی